صبحِ مشرق

سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۸ء

مجموعۂ کلام

میاں محمد صادق ضیاؔ چنیوٹی

بی - اے - ایل - ایل - بی

وکیل آگرہ

اشاعت اوّل اشاعت گاہ:- مکتبۂ قصر الادب آگرہ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء

میں نے بسائی ہے یہ دنیا الگ جہاں سے ‏ — ‏ بچ بچ کے خاکداں سے چھپ چھپ کے آسماں سے

لبریزِ ارتقا ہے پیمانۂ تخیّل ‏ — ‏ مانگے ہیں چند جرعے ساقیِ جاوداں سے

کیا جانے کس فضا میں ہے اے ضیاؔ تصوّر ‏ — ‏ کچھ نقش دیکھتا ہوں دھندلے سے بے نشاں سے

فہرست

انفرادیت۔ انسانیت اور زندگی۔

بس یہی تین لفظ میرے اس تمام سرمایۂ فکر پہ محیط ہیں

انسان کی ذہنی تعمیر تین دَور پہ منقسم ہے۔ سب سے پہلے جو چیز انسان کے سامنے آتی ہے وہ اس کی شخصیت ہے۔ شعوری کیفیات کے احساس کے بعد اس منزل سے گذرنا ناگزیر ہے۔ انسان کے ذہن و دماغ میں خیالات کی ایک دُنیا بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ اپنی ذات اور اپنی ہستی کے متعلق جو مواد انسان کے خیال میں محفوظ رہتا ہے وہ یقینی طور پر دوسرے موضوعات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اپنی ہستی کی معراج حاصل کر لینا **انفرادیت** کا انتہائے کمال ہے۔

دوسری منزل **انسانیت** ہے۔ انفرادیت اور انسانیت میں تصادم کا تصور تو خیر دُور از کار چیز ہے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارتقا کے لحاظ سے انسانیت کی منزل دوسری منزل ہے۔ یہ منزل پہلی منزل کی مخالفت نہیں کرتی بلکہ ذہنی تعمیر کے سلسلے کو اور آگے

بڑھاتی ہے۔

انسان اور انسانیت کے متعلق جو خیالات انسان کے دماغ میں وارد ہوتے ہیں ان کو اس دوسری منزل کے آثار میں شمار کیا جاتا ہے۔ انسان کیا ہے؟ وہ کیوں پیدا ہوا؟ اُس کی تخلیق کا کیا مقصد ہے؟ اور ذہنی طور پر انسان کیوں کر اکملیت کے درجے تک پہونچ سکتا ہے؟ یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے سوالات لازمی طور پر اپنا حل چاہتے ہیں۔

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ایک منزل زندگی کی اور باقی رہ جاتی ہے۔ زندگی کا تصوّر بہت وسیع ہے۔ اس منزل میں انسان کا خیال صرف اپنی ہستی یا اپنے ہم جنسوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ تمام کائنات ایک ہی سلسلے کی کڑی میں منسلک نظر آتی ہے اور انسان خود کو دائرہ زندگی کا ایک نقطہ سمجھنے لگتا ہے۔ زندگی کا احساس اور اسی کے ساتھ خیالات کی ایک وسیع دُنیا انسان کے ذہن میں عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ انسان زندگی کی اہمیت محسوس کرنے لگتا ہے اور کائنات کی کوئی چیز اُسے باطل معلوم نہیں ہوتی۔

میں نے مختصراً ان منزلوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ میری ذہنی تعمیر ان کی بہت زیادہ مرہون منّت ہے اور شعر و شاعری کے متعلق میرے خیالات ان ہی منزلوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

میں اس بات کی تصریح بھی وضاحت کے ساتھ کر دینا چاہتا ہوں کہ شعر و شاعری

میرے لئے رسمًا دلچسپی کا ذریعہ نہیں بلکہ شاعری میرے ان خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے جو میرے ذہن میں مرتسم ہو کر میرے قلبی حسیات کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ میں شعر کو من حیثیت الشعر اتنا اہم نہیں سمجھتا جتنا اُس مضمون اور اس تخیّل کو جو اُس شعر کی تخلیق میں کارفرما ہوتا ہے۔

میری نظر میں شاعری انسان کے لمحاتِ غور و فکر کا موزوں حاصل ہے جو لوگ اس کو محض تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ یقینی طور پر ایک پاکیزہ جذبے کی توہین کرنے میں مصروف ہیں۔

مجھے شعر و شاعری سے فطرتًا لگاؤ ہے اور میری ذہنی تعمیر میں شعریت نے کافی حصّہ لیا ہے میری چوبیس ۲۴ سالہ زندگی کے وہ لمحات جو ذوقِ شعریت میں صرف ہو کر ذہنی تکمیل میں معاون ہوئے میری زندگی کی بہترین ساعتیں ہیں اور میں ایک مقدس اور پاکیزہ جذبے کے ماتحت ان کی قدر کرتا ہوں۔ آجکل شعرا کی کثرت اُس کثرت کے تخریبی نتائج نے عام طور پر سوسائٹی کی ذہنیت میں شعر و شاعری کے خلاف یک گونہ منافرت پیدا کر دی ہے عام صورتِ حالات میں یہ جذبۂ منافرت کتنا ہی حق بجانب کیوں نہ ہو لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میری ذہنی تعمیر و تربیت شاعری ہی کی مرہونِ منت ہے۔ غور و فکر کی مسلسل عادتوں نے میرے ذہن میں زندگی کے متعلق چند نظریات محفوظ کر دئیے ہیں اور یہی نظریات میری طبیعت اور میرے ذہن کو ایک روش اور ایک اصول پر قائم کئے رہتے ہیں۔

شاعری کا تعلق انسان کے جذبات اور احساسات سے ہے۔ تخیّل جذبات کے استوار

کرنے میں معاون ہوتا ہے اور انسان کی سب سے بڑی تعلیم اس کے تخیّل کی تربیت ہی ہے۔ انسان کی ذہنی تخیّل کے کئی مدارج ہوتے ہیں اور سوچ بچار کے عادی انسان کو ان تمام مدارج سے گذرنا پڑتا ہے۔ انسان جتنا غور و فکر کا زیادہ عادی ہوتا ہے اُس کے تخیّل کی دنیا اتنی ہی وسیع ہوتی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک مفکّر انسان عملی حیثیت سے چند مخصوص خارجی پریشانیوں میں گھرا ہوا ہو لیکن خیالات کے اعتبار سے اس کی ذہنی تعمیر اکملیت کے درجے تک پہونچ گئی ہو۔ چنانچہ مجھے کئی مرتبہ یہ محسوس ہوا ہے کہ میں ذہنی اعتبار سے تخیلات کی دُنیا میں اتنی دور تک پہونچ گیا ہوں کہ اگر میں آج مر جاؤں تو مجھے یہ رنج نہ ہوگا کہ میری عمر اتنی مختصر کیوں تھی۔ خیالات کا ارتقا عمر کی پختگی پر محدود نہیں بلکہ بلوغِ غور و فکر پہ ہے۔ اسی حقیقت کے ادراک نے مجھے دنیائے تخیّل میں دعوتِ سیر دی اور یہی جذبہ میری شاعری میں کارفرما ہے۔

خیالات کی وسعت کا مفہوم یہ نہیں کہ انسان کثیر الافکار ہو اور زیادہ گوئی اس کا جزوِ حیات بن جائے۔ بلکہ میں تخلیقی جذبات کو خیالات کے سلسلے میں بہت اہم سمجھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان بہت زیادہ باتونی ہو لیکن اس کی باتیں چند مخصوص موضوعات پر مرتکز ہوں۔ یہ صورت اس صورت سے کسی طرح امتیازی نہیں کہ ایک انسان مختصر گوئی کا عادی ہو لیکن اس کی مختصر باتیں جدّت و ندرت کا پہلو لئے ہوئے ہوں۔

یہی تخلیقی جذبہ مجھے بھی خیالات کی نشو و نما میں مدد پہونچاتا ہے اور اپنی شاعری میں بھی میں

اسی کو پیشِ پیش رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جذبۂ تخلیق کے مٹ جانے سے انسان کی ذہنی موت واقع ہو جاتی ہے۔

انسانِ کامل کے معیار کا تعین میرا خاص مشغلۂ تخیّل ہے۔ جس وقت میں انسان کے متعلق سوچنے میں مصروف ہوتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کے صحیح نصب العین پر عامل ہوں۔ اور مجھے اس وقت اتنی مسرت ہوتی ہے کہ میں اپنی تمام مادی سرخوشیاں ان روحانی لمحات پر نثار کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہوں۔ یہی لمحات حقیقی شاعری کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور گو بعض اوقات میں اپنے لمحاتِ فکر کے حاصل کو اشعار میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اسوقت اشعار ہی کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے میری زندگی کے حقیقی لمحات یہی ہیں اور ان کے علاوہ میں جس قدر زندگی بسر کرتا ہوں وہ ایک رسمی اور عام زندگی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اس میں شک نہیں کہ میری شاعری نے مجھے محض تخیّلی انسان بنا دیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں انسانِ کامل کا صحیح معیار، انسان کے دماغ کی اکملیت اور اُس کے ذہن کے ارتقائے مدارج ہی پر قائم ہے۔

ہر عہد اور ہر زمانے میں انسانِ کامل کے متعلق ایک مخصوص نظریہ پایا جاتا ہے۔ انسان کی ضروریات، اس کے تخیّلی ارتقا اور کائنات کے لامحدود نظریات کی وجہ سے عہدِ جدید کا معیار ماضی سے کسی قدر مختلف ہے۔ عہدِ قدیم کا انسان تو اپنے تصورات میں اس قدر بہہ گیا تھا کہ

دیوتا بن جانا اس کے نزدیک انتہائے ارتقائے انسانیت تھا لیکن موجودہ دور کے انسان کو دیوتا نہیں بلکہ انسان بن کر جینے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خصوصیات کو عملی پیراہن دینے کی ضرورت ہے۔ عہدِ جدید کے انسانِ کامل کو صحیح معنوں میں انسان ہونا چاہیے۔ خدا یا دیوتا تو ماورائے انسانیت چیزیں ہیں اس لئے انسان کو ادُھر توجہ بھی نہ کرنی چاہیے۔ خیالات کے ارتقا نے انسان کے ذہن پر اب یہ حقیقت واضح کر دی ہے۔

انفرادیت اور انسانیت کے بعد زندگی میرا تیسرا مخصوص موضوعِ فکر ہے۔ میں دنیا کی ہر چیز میں زندگی کی تڑپ محسوس کرتا ہوں۔ انسان اور حیوانات سے گذر کر جمادات اور نباتات میں بھی مجھے زندگی موجزن نظر آتی ہے۔ میں کائنات کے ذرّے ذرّے میں زندگی کو موجود پاتا ہوں اور زندگی ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو مجھے کائنات سے وابستہ رکھتا ہے۔ شاعری کا مقصدِ اقصٰی یہ ہے کہ انسان میں اس احساسِ زندگی کو بیدار کرے۔

مختلف انسانوں میں یہ احساسِ زندگی مختلف نوعیتیں اختیار کرتا رہتا ہے۔ اور سوسائٹی کی تقسیم اکثر انھیں نوعیتوں کی بنا پر ہوتی ہے۔ ہر انسان کے تجارب کی روشنی میں اس کا معیارِ زندگی مرتب ہوتا ہے اور چونکہ تجارب کی نوعیت ہر انسان کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے زندگی کا نظریہ بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ایک ادیب اور ایک شاعر کا کام تو یہ ہے کہ وہ زندگی کے متعلق ایک مخصوص نظریے کو رواج دے۔ اور ایک حقیقی ادیب شاعر کے لئے مخصوص معیار

قائم کرلینا امرِ دشوار نہیں۔ کیونکہ اس کے ذہن میں صرف وہی خیالات آتے ہیں جو انسانیت کے ہر طبقے کو اپیل کرسکیں اور وہ صرف ان اجزا سے مرکب ہوتے ہیں جو صحیح طور پر انسانیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

بہترین آرٹ اور بہترین شاعری زندگی سے متعلق ہے۔ زندگی اصلِ شاعری ہے۔ انسان کو خدا نے زندگی عطا فرما کر شاید اس قدر کرم نہیں کیا جس قدر احساسِ زندگی کا جوہر دے کر اُس کی نوازش کی۔

کامیاب زندگی اُس انسان کی سمجھی جاتی ہے جو اپنی باطنی قوتوں کو اپنی عملی زندگی میں کامیابی کے ساتھ بروئے کار لاسکے۔ اور میرے خیال میں ان باطنی قوتوں کی تعمیر و تہذیب کا ذریعہ شاعری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

مندرجۂ بالا سطور سے واضح ہوگا کہ میں شاعری کو کس قدر اہم سمجھتا ہوں اور یہ بھی کہ میری نگاہ میں شعریت کس قدر مقدس ہے۔ میں نے شاعری کو محض تکمیل تفریح کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا بلکہ اس سے ہمیشہ اپنی ذہنی تعمیر میں مدد لی اور اب بھی اپنی ذہنی تعمیر کے لئے میں شاعری کو ناگزیر سمجھتا ہوں۔

جذبۂ شاعری خیالات کے استوار کرنے کے علاوہ زندگی میں اور فرائض بھی انجام دیتا ہے اور وہ فرائض متعلق ہیں اُس انقلاب سے جس سے انسان کو اپنی زندگی میں ہر سانس پر

دوچار ہونا پڑتا ہے۔ زلزلہ، جنگ، وبا، طوفان، خون اور فساد وغیرہ تو ایسے انقلابات ہیں جو آناً فاناً انسان کی زندگی کا ورق اُلٹ دیتے ہیں۔ اور ایسے انقلابات کے نتائج بھی اسی قدر خوفناک ہوتے ہیں یہاں اُن کا ذکر نہیں، میں جس نوعیت کے انقلاب کا ذکر کر رہا ہوں وہ انسان کی شخصی زندگی سے متعلق ہے۔ ہم زندگی کے دوسرے مسائل میں اس قدر سرگرم اور محو رہتے ہیں کہ اس انقلاب کو محسوس نہیں کرتے ورنہ اگر ہم اُس کی اہمیت کا اندازہ کریں توفی الحقیقت اس کو ہماری زندگی میں بہت بڑا دخل ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ایک بچے کا سنِ شعور کو پہونچنا، پھر جوان ہوجانا۔ پھر جوانی سے بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھنا جذبات میں تموج و تکاہل اور مدوجزر وغیرہ کیا یہ سب باتیں ایک عظیم انقلاب نہیں؟ جہاں شاعری ہم کو اس انقلاب سے روشناس کرتی ہے وہاں خوشگواری کے ساتھ ان منزلوں سے گزرنے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے۔

بہرکیف شاعری تربیت ذہنی کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کا مقابلہ علم و ادب کا کوئی دوسرا شعبہ نہیں کرسکتا۔ موضوعِ شاعری کا بہت زیادہ حصہ محسوسات سے متعلق ہے۔ جن کو انسان محسوس کرسکتا ہے لیکن بیان کرنے میں کامیابی حاصل کرنا بہت دشوار ہے۔ میرا یہ مجموعۂ کلام محسوسات کی ترجمانی ہی کی ایک کوشش ہے ——— میں خود نہیں سمجھ سکتا کہ اس سلسلے میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے ——— اس کا فیصلہ

قارئینِ کرام اور ناقدینِ فن پر چھوڑتا ہوں۔

شعر و شاعری پر اپنے نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند سطروں میں اس مجموعے کی ترتیب و تدوین کے متعلق بھی کچھ عرض کر دوں۔

"صبحِ مشرق" کی نظمیں اور غزلیں میری تعلیمی زندگی کے دورِ ماضی سے متعلق ہیں۔ تعلیمی زندگی کے ساتھ جب ادبی زندگی بھی شریک ہو جائے تو پھر اُس کی شعریت اہمیت ناقابلِ انکار ہو جاتی ہے۔ ان مشترک اثرات کا اندازہ ان اوراق سے کیا جا سکتا ہے۔

ممکن ہے میرے یہ الفاظ خود نمائی پر محمول کئے جائیں لیکن میری موجودہ زندگی فی الحقیقت اُس سے قطعاً مختلف ہے جو زمانۂ طالب علمی میں تھی جس کی یادگار یہ مجموعہ ہے۔ اس لحاظ سے جب میں اپنے ماضی و حال پر نگاہ کرتا ہوں تو مجھے اپنی ذہنی انفرادیت دو حصوں میں منقسم محسوس ہوتی ہے۔ وہ زندگی، زندگی تھی۔ اور موجودہ زندگی اس کا عکسِ محض ہے۔ اسے خودستائی نہ سمجھئے بلکہ یہ "کالج" اور "قصر الادب" سے وابستگی پر صرف ایک مجمل تبصرہ ہے

محمد صادق ضیا

آگرہ
۱۲ / اپریل ۱۹۳۸ء

مصنّف

اذانِ زندگی

بسم اللہ تعالیٰ

نذرِ عقیدت

حریمِ انسانیت میں

اے کہ تری حیات ہے رحمتِ بزمِ دو جہاں
تجھ سے ہے کائنات میں امن و سکونِ جاوداں

تجھ سے کھلے نگاہ پر بزمِ الوہیت کے راز
تیری ہر اک نظر بنی آئینۂ رخِ مجاز

تو نے اٹھا کے خاک کو عرش وقار کر دیا
ذرۂ خواب ناک کو صبحِ بہار کر دیا

تو نے دیا لباسِ نو کہنہ سرائے دہر کو
تجھ سے ملی شگفتگی نشو و نمائے دہر کو

اشرفِ خلق آدمی تیرے وجود سے ہوا
آدمیت کا ارتقا تیری نمود سے ہوا

تیرے ہی ہاتھ سے کھلا عقدۂ بابِ زندگی
تیری زبان سے ہوئی شرحِ کتابِ زندگی

شامِ ابد نے دی اذاں تیرے حریمِ ناز سے
صبحِ ازل ہوئی طلوع خوابگہ حجاز سے

بسکہ ہے محفلِ جہاں محوِ فغان و اضطرار
بھول گیا ہے آدمی فطرتِ صبحِ لالہ زار

مزرعِ زندگی میں آج آگ سی ہے لگی ہوئی
صبح بھی سوزناک ہے شام بھی ہے جلی ہوئی

شورشِ کائنات کو حوصلۂ قرار دے
سلسلۂ حیات کو از سرِ نو سنوار دے

ہے مری ابتدائے فکر تیرے ہی پاک نام پر
ختم ہو ہدیۂ نیاز جذبۂ احترام پر

نویدِ نو

سنہ ۱۹۳۱ء

فضا خاموش، بے آواز ہنگاموں کی بستی تھی
مسلسل، غیر محسوس ایک مستی سی برستی تھی

جہاں ظلمت میں تھا، اور آسماں پہ چاند روشن تھا
سکوت آلود تھے صحرا، حجاب آلود گلشن تھا

بساطِ نیلگوں پہ جو ستارا رقص فرما تھا
نظا ہر ذرہ میں ڈوبا ہوا سا ایک نغما تھا

بہا جاتا تھا میں اپنے خیالوں کی روانی میں
حبابِ موج جیسے بہہ رہا ہو تیز پانی میں

مری فکرِ درخشاں عرش تک پرواز کرتی تھی
پھر اپنے اوج و رفعت پہ غرور و ناز کرتی تھی

فرشتہ دفعتاً اک پردۂ اسرار سے آیا
مجھے اپنی صداؤں میں پیامِ نو یہ پہنچایا

جمودِ مستقل طاری ہے انسانوں کی بستی پر
اندھیرا چھا رہا ہے ہر بلندی اور پستی پر

خدائی خوابِ غفلت میں پڑی دن رات سوتی ہے
تھپک دیتی ہے دنیا آنکھ اگر بیدار ہوتی ہے

وہ محفل جو کبھی شادابیوں کا ایک گلشن تھی
وہ محفل جو کبھی رعنائیوں کی ایک دلہن تھی

وہ محفل جس پہ ہر دم راحت و رحمت برستی تھی
وہ محفل جس میں نیکی تھی، وفا تھی، حق پرستی تھی

وہ محفل جسمیں چرچا تھا سعادت کا صداقت کا
وہ محفل جسمیں بجتا تھا گجر حق و عدالت کا

اُسی بزمِ طرب میں آجکل شیطاں رجز خواں ہے
وہی فردوسِ فطرت ان دنوں آتش بداماں ہے

لگا دی آگ اس فردوس میں غدّار انساں نے
گناہوں سے کیا ہی ساز پھر بدکار انساں نے

جب اس انساں کو غفلت نیکیوں سے دور کرتی ہے
تو ناکہ وہ گناہوں کے لئے مجبور کرتی ہے

مجھے انساں کی اس فطرت پہ پیچ و تاب آتا ہے
کہ جو آتا ہے اس محفل میں محوِ خواب آتا ہے

یہ انساں جاگ اُٹھے جس سے وہ ساماں پیدا کر
طبیعت کی روانی سے کوئی طوفان پیدا کر

جگا دے خوابِ غفلت سے پھر اس مدہوش انساں کو
بنا دے اک نیا سازِ عمل، خاموش انساں کو

پیام اپنا سنا کہ وہ فرشتہ ہوگیا رخصت
مجھے دنیا نظر آنے لگی گہوارۂ فطرت

ستارے اک نیا پیغام دیتی تھی اشاروں سے
قمر چپکے ہی چپکے کہہ رہا تھا کچھ ستاروں سے

"یہ بادل بن کے گرجے گا یہ بجلی بن کے کڑکے گا"
"ضیا ساری فضا یہ ایک شعلہ بن کے بھڑکے گا"

میں اس الہام کی قوت سے اب اک صور پھونکوں گا
نئی اک روحِ بیداری قریب و دور پھونکوں گا

میں اس انساں کو اب خوابِ غفلت سے جگاؤں گا
محبت سے نہ جاگے گا تو نفرت سے جگاؤں گا

گنہگاری کی جڑ بھی ساری دنیا سے مٹا دوں گا
میں اس آتشکدے کو ایکدن جنت بنا دوں گا

نہ روک اے مصلحت بینی مجھے انگڑائی لینے دے
حقیقت کی طرف دنیا کا پہلو پھیر دینے دے

نواسیرِ قیدِ ہستی آ مری آواز سن!

جب رگِ انسانیت میں عزم کرتا ہے گذر — شوق آتا ہے نکل دیوارِ آہن توڑ کر
خون میں جب آتشِ احساس ہوتی ہے رواں — سانس سے بن بن کے انگارے، نکلتا ہے دھواں
جذبۂ آزاد جب ہوتا ہے دل میں موجزن — شیر کے پنجے میں بھی ہرگز نہیں کٹتا ہرن
خوئے خود رائی جب اپنا رنگ لاتی ہے کہیں — ایک ہی ٹھوکر سے ہل جاتے ہیں افلاک و زمیں
اور جب بیچارگی کرتی ہے عزمِ احتجاج — سر پہ اک مزدور کے سلطان کا ہوتا ہے تاج
عزم اور احساس سے گرمی بڑھا جذبات میں — چاند بن کر ہو ضیا افشاں اندھیری رات میں
اپنے ہم سن سر فروشوں، رجز خوانوں کو بھی دیکھ — خون میں جو لوٹتے ہیں اُن جوانوں کو بھی دیکھ
اپنے مستقبل کی اپنے ہاتھ سے تعمیر کر — بیٹھ جا اقبال کے سینے میں پہلو چیر کر

سرد بازاری یارانِ چمن کو پھونک دے
اور حائل ہو تو ساری انجمن کو پھونک دے

ایشیا کے نوجوان سے

آفتابِ تازہ ہے، پیغمبرِ صبحِ شباب
ظلمتِ شب ہو چکی ہی جذبِ نورِ انقلاب

مطلعِ اُمید پر آثارِ بیداری ہیں آج
منظرِ تجدید پر جلوے نئے طاری ہیں آج

ساقئ نو لے کے آیا ہے پیامِ زندگی
ہے سنہری بادۂ زریں سے جامِ زندگی

صبح میں خوشبو ہے دامانِ اُفق میں نور ہے
عطرِ کیف و رنگ و بوسے ایشیا معمور ہے

بارشِ شبنم نے دھوئے داغ ساری رات کے
چن لئے خورشید کی کرنوں نے تارے رات کے

جاگنا مشرق کا ہے مغرب کی بیداروں کی نیند
ہے طلوعِ مہر جیسے چاند اور تاروں کی نیند

جاگ اُٹھ اے نوجواں، پھر قافلہ تیار ہے
صبحِ مشرق لیلئ منزل کی جلوہ دار ہے

ہے نگاہِ ایشیا تیری طرف اے نوجواں
اور تیری رفتار پر دار و مدارِ کارواں

جادۂ ہستی میں پیدا کر وہ آئینِ خرام
قافلہ آسودۂ منزل ہو تیرا قبلِ شام

تو شعاعِ تازہ ہے، تو صبح کی پہلی کرن
دفعتاً کر دے منوّر وسعتِ دشت و چمن

مغربی تہذیب کے گردابِ باطل سے نکل
اِن فریبی شعبدہ بازوں کی محفل سے نکل

تجھ کو صرف انکی غلامی ہی نہیں ہی ناگزیر ذہن اور اخلاق بھی تیرا ہے پابند اسیر

قلعۂ تہذیبِ بیگانہ کو یوں مسمار کر باہر آجا اس کے بام و در کو ٹھوکر مار کر

ظلمتِ مغرب میں کیا باقی، بجز تخریب ہی

صبح گاہِ ایشیا ہی خالقِ تہذیب ہی

ایشیا ہے ندرتوں کا اک جہاں تیری لئے کونسی دولت نہیں پیدا یہاں تیری لئے

ایشیا ذرہ جلوہ گاہِ مشرقِ خورشید و ماہ گیسوئے فطرت کا شانہ، فرقِ عظمت کی کلاہ

خانقاہِ اولیاء و انبیاء، رشیوں کا گھر جلوہ گاہِ علم و حکمت، عظمتوں کا مستقر

چوٹیاں اسکی پہاڑوں کی ہیں سازِ ارتقا آرہی ہے رات دن کانوں میں آوازِ درا

پستیوں سے جادۂ معراج کا آغاز کر کارواں کو ساتھ لے، پر کھولدے، پرواز کر

مشرقی تہذیب اور اخلاق کو پرچم بنا دہر کی کہنہ سرا میں اک نیا عالم بنا

دے ثبوت اس کا کہ تو ہے پاسبانِ ایشیا

اے شبابِ ایشیا، اے نوجوانِ ایشیا

ہے جدا مغرب کی دنیا سے جہانِ ایشیا یہ زمینِ ایشیا، یہ آسمانِ ایشیا

کرشن، گوتم، خواجہ و اقطاب کی محفل ہے یہ ہے تقدس ہی تقدس آستانِ ایشیا

یہ بھرے گلشن یہ دریا ایشیا کی جنتیں یہ درے یہ کوہ و وادی پاسبانِ ایشیا

ہے اسی فطری تناسب سے یہاں تہذیب بھی ہیں بہار و برق و باراں ترجمانِ ایشیا

لوٹ آ اُس مغربی آتشکدے سے لوٹ آ روح کی تسکین ہے یہ خاکدانِ ایشیا

گا وہ نغمے جن سے عظمت ایشیا کی ہو عیاں ایشیائی ساز پر، اے نوجوانِ ایشیا

اپنے گھر کو گھر سمجھ، عرفانِ فطرت ہے یہی

کیا غرض مغرب سے تجھ کو تیری جنت ہے یہی

پھر رات!

کون آیا ہے یہ کاشانے میں روشنی ہے مرے غم خانے میں

شمع کی لَو ہیں ثریّا رخشاں سوزِ پروانہ میں سازِ عرفاں

سُرخ پھولوں میں وفا کا عالم بند کلیوں میں ضیا کا عالم

چاند میں نور کے دریا موّاج ذرّے ذرّے کو دماغِ معراج

آسمانوں پہ شگفتِ انوار چاند تاروں سے نمودِ اسرار

آہ یہ عالمِ نَو، واہ یہ رات عشق کی قدر بقدرِ جذبات

زانوئے دوست پہ معراجِ نیاز شہپرِ شوق کو اذنِ پرواز

پہلی کرن

اے اُفق سے جھانکنے والی شعاعِ آفتاب — جگمگا دی تو نے آتے ہی مری دنیائے خواب
صبحِ ہستی کا نیا پیغام لے کر آئی تو — زندگی کا اک چھلکتا جام لے کر آئی تو
چھپ گئے چاند اور تارے ہو گئیں شمعیں خموش — آنکھ ذرّوں کی کھلی آیا گا پھولوں کو ہوش
لیکن اے سطحِ منوّر کیوں ہے لرزاں اس قدر — خوف سا طاری ہے تیری طلعتِ معصوم پر
تو کہ ہے بیداریِ عالم کا اک زرّیں پیام — اے کرن، یہ اضطراب و خوف سے کیا تجھ کو کام؟

تیری آوارہ خرامی رفعتوں پر مست ہے
کاوشوں سے عالمِ فانی کی بالادست ہے

رات کی تاریکیوں کو کر چکی ہیں پاش پاش — ہیں جو پُر ظلمت مجھے اب اُن دلوں کی ہے تلاش
مطلعِ عالم کو اپنی ضو سے چمکاتی ہوں میں — پھر بھی دنیا میں اندھیرا ہر طرف پاتی ہوں میں
مستقل تاریکیاں ہیں عالمِ امکاں میں آج — بجھ گئیں ہیں روح کی شمعیں دلِ انساں میں آج
کل جو تھی بیدار قسمت، آج خفتہ بخت ہیں — یہ اندھیری رات کی تاریکیوں سے سخت ہیں

ان میں تخلیقِ ضیا کی آرزو رکھتی ہوں میں
تیرگی میں بھی مذاقِ جستجو رکھتی ہوں میں

روزِ ہستی کے خرابی تک پہونچ جاتی ہوں میں
سو اُجالے مشرقِ فطرت سے برساتی ہوں میں

آہ ساری کوششیں ناکام ہوتی ہیں مری
آسمانی قوتیں بدنام ہوتی ہیں مری

اب سے پہلے تھی موثر کامیاب و بے پناہ
صبح کی پہلی کرن، اور حسن کی پہلی نگاہ

حسن اثر سے اور میں اُمید سے محروم ہوں
خطرۂ مستقبلِ افراد سے مغموم ہوں"

افسردہ جو تنہائی سے ہو جاتا ہوں
گلگشتِ گلستاں میں سو جاتا ہوں
تا عرش سے خیالوں کی طرح میں بھی ضیا
تاروں کی تجلیوں میں کھو جاتا ہوں

جذبۂ نمود

وہی منظر وہی شادابیاں ہیں سبزہ زاروں میں
وہی جھولے پڑے ہیں لالہ و گُل کی بہاروں میں

رباب دل کا دھوکا ہے حبابِ موجِ دریا پہ
وہی بیدار موسیقی رواں ہے جوئباروں میں

حقیقت جس نے روشن مجھ پہ کر دی بزمِ عالم کی
مجھے اب بھی نظر آتا ہے وہ جلوہ ستاروں میں

ابھی تک ذرّے ذرّے میں وہی خورشید لرزاں ہے
وہی موتی مچلتے ہیں ابھی تک آبشاروں میں

صبا میں ہے وہی شوخی، وہی نکہت میں دلجوئی
وہی ہے تیتری کا رقص پھولوں کی قطاروں میں

وہی جنگل کی محویّت وہی کھیتوں کی خاموشی
وہی بادل کا نغمہ وادیوں میں کوہساروں میں

وہی گھیرے ہوئے ہر سمت سے نیرنگ ہستی کا
وہی افزائشِ جذبات فطرت کے اشاروں میں

شریکِ جذبۂ فطرت وہی ہے جذبۂ دل بھی
وہی بانگِ درا ہے اور وہی اعلانِ منزل بھی

مرے سینے میں پنہاں ہیں ضیا خیز چنگاریاں اب بھی
مری ہر سانس سے پیہم نکلتا ہے دھواں اب بھی

توجّہ جسمِ خاکی کا ہے رفعت کی طرف اب تک
زمیں کی پستیوں میں ہے مذاقِ آسماں اب بھی

چُنا کرتا ہوں تارے اب بھی اپنی شامِ خلوت میں
ہے بوندوں کو لپیٹے کی دماغِ کہکشاں اب بھی

شبابِ فکر پہ رعنائیاں فطرت کی طاری ہیں
معطر ذہن ہے اب بھی طبیعت ہے جواں اب بھی

جو اپنی ایک کروٹ میں اُلٹ دے تختۂ گیتی
وہ اک بیتاب دل ہے میری پہلو میں نہاں اب بھی

قلم کی جنبشوں سے رازِ ہستی فاش کرتا ہوں
حقیقت کا نہیں ہے کوئی مجھ سا ترجماں اب بھی

فلک پرواز ہیں اب بھی مری تخئیل کی شعلے
مثالِ کوہ میرا قلب ہے آتش فشاں اب بھی

بساطِ زندگی پہ حشر ساماں بن کے نکلوں گا
وہ قطرہ ہوں کہ وقت آتے ہی طوفاں بنکے نکلونگا

استقلال

زندگی کا کوئی شعبہ ہو تجارت ہو کہ جنگ
مستقل سب میں رہے، یہ فرض ہے انسان کا

کامیابی کیا ہے اک انعامِ سعئی مستقل
اک تسلسل ارتقا ہے زندگی کی شان کا

جتنی قومیں مستقل اپنے ارادوں میں رہیں
دبدبہ باقی رہا دُنیا میں اُن کی آن کا

جو تجارت مستقل بنیاد پر قائم ہوئی
اسکے مستقبل کو اندیشہ نہ تھا نقصان کا

عزمِ راسخ ہو تو انساں کاٹ سکتا ہے پہاڑ
راستہ ہموار کر سکتا ہے کوہستان کا

سیکھ پامردی کہ منزل تجھ سے ہو جائے قریب
اے مسافر صرف جھگڑا ہے اسی فقدان کا

اک تغیّر افقِ ہند میں پیدا کر دیں
آ، سوادِ شبِ محفل میں اُجالا کر دیں

گرم نغموں کی نواؤں سے جگا دیں سب کو
سوز سے ساز کی آواز دو بالا کر دیں

اُٹھ کہ ہم عزم کی کرنوں کو پریشاں کر کے
آج شیرازۂ اقوام کو یکجا کر دیں

محفلِ ناز کو دیں دعوتِ احساسِ نیاز
وادیٔ طور کے ہر ذرے کو موسیٰ کر دیں

مرگ آلودہ ہے غفلت سے رگ و ریشۂ دہر
آج پھر اپنی نوا سے اسے زندا کر دیں

جن سے فردوس کی پیدا ہو نشاطِ معصوم
زندگی کے وہی آثار ہویدا کر دیں

فرق کچھ برہمن و شیخ میں باقی نہ رہے
ایک ہی فطرتِ بت خانۂ و کعبہ کر دیں

مضطرب قلب کو پیغامِ سکوں کا دے کر
مستقل درد کو تسکینِ سراپا کر دیں

بے سہاروں کیلئے کوئی سہارا ڈھونڈیں
بے قراروں کے لئے صبر مہیا کر دیں

کوئی تکلیف گوارا یہ کرے یا نہ کرے
اپنے ہاتھوں سے مرتب نئی دنیا کر دیں

نوجوانانِ ہندوستان کو پیغام

اٹھو اے نوجوانو، خواب سے انگڑائیاں لے کر
تغافل کوشیاں تا کے، تجاہل کیشیاں کبتک؟

یہ خوابِ حریت آغوشِ غفلت میں، معاذ اللہ
تباؤ تو رہے گی مختلف دل سے زباں کبتک؟

تمہاری بےحسی پر خندہ زن ہر صبح ہوتی ہے
یہ اس آئینہ پر زنگ کی رسوائیاں کبتک؟

تمہارا دردِ اشک بے علاج و لا دوا کیوں ہے؟
تمہاری ہستی منت کشِ بانگِ درا کیوں ہے؟

تمہارے ہم نوا ہیں باریابِ قصرِ آزادی
مگر تم صرفِ گردش ہو غبارِ کارواں ہو کر

حیاتِ جاوداں ہے اشک کی صورت فنا ہونا
تمہیں جینا سکھا دے گا، لہو اپنا رواں ہو کر

اک ایوانِ حریت کا، کاوشیں تعمیر کریں گی
کہ قطرہ بحر بن جاتا ہے موجوں میں نہاں ہو کر

جگا کر ہندیوں کو سوئے گی سکھ نیند بربادی
اسی ظلمت سے ہوگی جلوہ گر لیلائے آزادی

ہوا اوجِ فلک پر جلوہ گستر مہرِ آزادی
سنا دو اہلِ مغرب کو کھلیں مشرق کی تقدیریں

ہے فقدانِ تاثر تک یہ تاریکی غلامی کی
ابھی احساس جاگ اٹھا ابھی کٹ جائیں زنجیریں

خرابِ حرص ہونا، پھر غلط کوششِ عمل رہنا
مبارک اہلِ ثروت کو یہ دیوالوں کی جاگیریں

تجھے گر آرزو ہے اس زمانے میں چمکنے کی
تماشا کر ستاروں میں درخشانی کی تفسیریں

ہماری ضبطِ غم پر آگ نے برسا دیا پانی
تڑپ کر رہ گئیں ظالم کی خوں آشام شمشیریں

وہ جذبے مٹ گئے جو حیدرؓ و خالدؓ نے بخشے تھے
ذراسی خاک نکلی گی، ہمارا دل اگر چیریں

یہ دعویٰ قومیت کا، یہ جمودِ عالمِ انساں
یہ آزادی کے نعرے اور یہ پُرجوش تکبیریں!

الٰہی! خفتہ بختوں کے دلوں میں بجلیاں بھر دے
انہیں ذوقِ صحیحِ حُرّیت سے آشنا کر دے

گلگشت کو آ، بادِ چمن سے پہلے
چن پھول، شگفتِ نسترن سے پہلے
دن اُسکا ہے، باغ اسکے ہیں، روش اسکے ہیں
جاگا ہے جو سورج کی کرن سے پہلے

سازِ قومیت

رونقِ گلشن ہیں دونوں پھول بھی اور خار بھی
جلوۂ قدرت کا مظہر نور بھی ہے نار بھی

باغ کی شیرازہ بندی سے ہے نظمِ گلستاں
سینکڑوں افراد کا مجموعہ ہے اک کارواں

اتحادِ بزم میں پنہاں ہے جمعیّت کا راز
نو بہ نو لحنوں کا حامل فطرتاً ہوتا ہے ساز

منسلک ہو ایک ہی رشتے میں دنیا کا نظام
مختلف اجزا کے مجموعے سے ہے اس کا قیام

قومیت کی پرورش کا بھی یہی اک راز ہے
محفلِ انساں ہے اک آہنگ، قوم اک ساز ہے

آہ لیکن گلستاں جب ہو خرابِ انتشار
آہ جب عنوانِ افسانہ ہو فرقِ نور و نار

آہ فطرت میں نمو پا جائیں جب حرص و نفاق
آہ جب ہر برگِ گلشن ہو ہوا خیزی میں طاق

ٹوٹ کر گل شاخ سے ہو جائیں جب صرفِ زمیں
منتشر ہو جائے جب تاروں کی ضوئے دلنشیں

بحر سے ہو کر الگ ہونے لگیں موجیں رواں
منزلِ مقصود سے جب منحرف ہو کارواں

آہ تیرہ بختیاں جب قافلے کو لوٹ لیں
آہ جب روشن ضمیر افراد سینہ کوٹ لیں

آہ جب انسان دردِ قوم سے بیزار ہو
انجمن کی انجمن مفلوج ہو بیمار ہو

قوم بننے کا ہر اک انسان جب دعویٰ کرے قومیت کے ساز پر خود رات دن ناچا کرے
کیوں ندامت میں نہ ہو تبدیل نازِ قومیت
کیوں نہ آخر ٹوٹ کر رہ جائے سازِ قومیت

میرے ارادے

میں بجلی بن کے کڑکوں گا، اندھیروں کو مٹا دوں گا میں بادل بن کے گرجوں گا دلوں کو تھرتھرا دوں گا
سبق حق کا پڑھا دوں گا، پیامِ حق سنا دوں گا میں یکسر صفحۂ دنیا سے باطل کو مٹا دوں گا
میں شاعر ہوں، مجھے آتا ہے عالم کو جگا دینا کیا جب ایک نعرہ، ساری محفل کو جگا دوں گا
بہت دن سے یہ انساں سو رہے ہیں خوابِ غفلت میں دلوں سے ان کے پردے بے حسی کے سب اٹھا دوں گا
زمانہ آ رہا ہے ختم ہو گی ظلمتِ ہستی ضیائے قلب سے اپنی میں دنیا کو ضیا دوں گا
میں بڑھ کر روک دوں گا سب یہ ہنگامے غلامی کے میں آزادی کا ڈنکا بزمِ عالم میں بجا دوں گا
ضمیر و روح کی قوت بروئے کار آنے دو میں استبداد کے ایواں کی بنیادیں ہلا دوں گا
فضا کی گرم تابی مجھ سے تیور کیوں بدلتی ہے
فضا میں آگ اپنے سوزِ پنہاں سے لگا دوں گا

ابدیّت کی کرنیں گہوارۂ طفلی میں

(ورڈس ورتھ)

سنہ ۱۹۳۲ء

عہدِ طفلی میں، یہ دشت و کوہ اور یہ سبزہ زار — یہ ندی نالے یہ دریا اور رقصاں آبشار
سب لباسِ روح میں ملفوف آتے تھے نظر — ہو شعاعِ خواب جیسے تابناک و نور بار
وہ تجلّی آہ، اب نظروں سے پنہاں ہو گئی — رات ہو یا دن، نہیں نورِ حقیقت آشکار

آسماں پہ عشرتِ نظارہ ہے قوسِ قزح — اس کی یہ رنگینیاں بھی ہیں گلستاں در کنار
دیکھتا ہی چاند بھی سرشار ہو کر کیف سے — آسماں کی وہ فضا جو ہے نہایت خوشگوار
یہ طلوعِ صبح یہ سورج کی بیداری یہ نور — اور یہ تاروں بھری راتوں میں دریا کا نکھار
میں جہاں جاتا ہوں یہ محسوس ہوتا ہی مجھے — چھن گیا ہے عالمِ ہستی سے روحانی وقار

اب وہ رنگ اس عالمِ مستور کا باقی نہیں
اب اُفق پر وہ دھندلکا نور کا باقی نہیں

گونجتے ہیں جب بھرے گلشن میں مرغانِ چمن
اور جب گلے میں ہو جاتی ہیں بھیڑیں نغمہ زن

دفعتاً احساسِ غم اپنا بھلا دیتا ہوں میں
اس سرودِ خوش سے ہو جاتا ہے دل بیر افگن

آبشار اپنا پہاڑی پر بجاتے ہیں رباب
اب نہیں اس فصل میں گنجائشِ رنج و محن

خواب آور کھیتیوں سے پھر ہوا آنے لگی
پھر پسِ کہسار سے آئی صدائے غم شکن

اے گو اسے آ مرے چاروں طرف پھر رقص کر
دیکھ اسے ابنِ مسرت ہے جہاں عشرت فگن

جانور سرشارِ موسم ہو کے سب مسرور ہیں
اپنے نغموں کے اثر کی ڈال دی مجھ پر کرن

سن چکا ہوں میں یہ میمیانے کی اے بھیڑ و صدا
ہے تمہاری اس خوشی میں شرکتِ چرخِ کہن

دل تمہارے ساتھ اس احساس میں سرشار ہے
میری گردن میں تمہاری ہی خوشی کا ہار ہے

نامبارک تھا یہ دن ہوتی نہ گر مجھ کو خوشی
یہ فضا، اور یہ بہار، اور چار سو آسودگی

کر رہے ہیں جمع بچے پھول تازہ ہر طرف
اور ہے سورج کی کرنوں میں شرارِ زندگی

اک درخت اک کھیت میری سامنے موجود ہے
پھول بھی گر کر مرے قدموں پہ کہتا ہے یہی

آہ وہ خوابِ نظر افروز میرا کیا ہوا؟
اُف وہ اک معصوم لمحہ، وہ مبارک اک گھڑی

ہے ہماری زندگی خوابِ فراموشِ ازل
یا ہے اک تارہ جو نکلا تھا ہماری ساتھ ہی

وہ یہاں آنے سے پہلے بھی ہوا تھا گو غروب
اور طے کرنے پڑے تھے راستے اس کو کئی

یاد ہیں لیکن اسے اپنے گزشتہ واقعات بھول جانا ان کا ہے دشوار اس کو واقعی
بادل اپنے ساتھ ہم لاتے ہیں کچھ برکات کے اور گہوارے میں اپنے کھیلتی ہے خلد بھی

روح کچھ دیکھے ہوئے کی یاد میں بیتاب ہے
عالمِ فانی کوئی بھولا ہوا سا خواب ہے

ایک نوزائیدہ بچہ بڑھ کے ہوتا ہے جواں رفتہ رفتہ بھول جاتا ہے وہ کیفِ جاوداں
اسکی نظروں سے گذرتی ہے خوشی کی اک کرن سامنے ہوتا ہے مطلع، پھوٹتی ہے وہ جہاں
روح کے مشرق سے روزانہ ہو جاتا ہے دور اس جواں کیساتھ بھی رہتا ہے نور اک ضوفشاں
رفتہ رفتہ ہوتی ہے معدوم بالکل وہ شعاع زندگی میں اس کو ہوتا دیکھتا ہے رائیگاں
اپنے فرزندوں کی کرتی ہے نگہداری زمیں جمع کر دیتی ہے سامانِ محبت بیکراں
مادرانہ مہر ہے سوتیلے بچوں کے لیے یعنی ہر انسان کی کرتی ہے مہماں داریاں
تاکہ وہ برکاتِ روحانی کے قصے بھول جائے اور وہ ایوانِ رنگیں، جلوہ آرا تھا جہاں

خواب سا ہوتا ہے طاری اس طرح انسان پر
بھول جاتا ہے جو آتا ہے ازل میں دیکھ کر

آہ یہ معصوم بچہ کس قدر طرّار ہے عشرتِ ماحول سے مسرور ہے سرشار ہے
اپنے خود تیار کردہ ہیں کھلونے اسکی پاس کھیل میں اس کے وہ بوسوں سے دخیل کار ہے
باپ کی چشمِ عنایت پڑ رہی ہے بار بار پاؤں کے پاس ایک نقشہ سا کوئی تیار ہے

اس کے خواب زندگی کے منتشر ٹکڑے ہیں یہ
جن میں اس بچے کی معلومات کا اظہار ہے

جذب کرلیں گے اسباب ماتم و شادی و غم
اب یہی اک نغمہ اس کے ساز میں بیدار ہے

اب یہ سیکھے گا محبت یا عداوت کی زباں
اس سے پھر برگشتگی فطرت کا اک معیار ہے

دوسرا گہوارہ پھر لے گا یہ چھوٹا اکٹھا
جس میں نیکی ہے کہیں پنہاں کہیں پندار ہے

لاتی ہے اسٹیج اس کا ساتھ اپنے زندگی
جس جگہ گویا مسلسل اک تماشہ ہے یہی

اے کہ ظاہر میں ترے پنہاں ہے قوت روح کی
اے بزرگ، اے صاحب عز و وقار، اے فلسفی

اے کہ حاصل ہے تجھے اندھوں میں بالا تر نظر
یہ تری پنبہ بگوشی پھر یہ تیری خامشی

منہمک رہتا ہے تو فطرت کی ہر گہرائی میں
تشنہ ہائے تجھ میں پنہاں ہیں دیار قدس کی

اے منجم اے پیمبر اور اے فطرت شناس
تجھ پہ روشن ہیں حقائق تجھ میں ہے وہ روشنی

ہم نے جس کی جستجو میں صرف کردی اپنی عمر
اور جو تاریکیوں میں قبر کی گم ہو گئی

حیثیت جیسے ہو اک آقا کی ہمراہ غلام
صبح بن کر تجھ پہ روشن ہے دوام زندگی

چھوٹے بچے! تھی جو آزادی تجھے روز ازل
اس کا حامل تو ہے اب تک میرا ایماں ہے یہی

اپنے مستقبل کی الجھن یاد کیوں کرتا ہے تو
وہ ازل کی برکتیں برباد کیوں کرتا ہے تو

روح مری جلد ہو جائیگی پُر گرد و غبار — زندگانی بوجھ کندھوں پر رکھے گی ناگوار

بار ہو جائیں گے تیری روح پر رسم و رواج — گھر سے تاریک، مثلِ زندگی الوار بار

محو گو ہم کر چکے ہیں اپنی روحانی فضا — پھر بھی کچھ ہم میں ابھی باقی ہیں پوشیدہ شرار

تجربے بچپن کے فطرت کو ابھی کچھ یاد ہیں — جو گذرنے والے اتنی جلد تھے انجام کار

یادِ طفلی سے ہی پیدا دل میں اک احساسِ شکر — وہ خوشی وہ ولولہ آزادیوں کا وہ نکھار

موجزن ہائے نہ تھے یہ جذبے ہمیشہ قلب میں — ہیں نہیں ان کے لئے ممنون اور منت گزار

بلکہ ظاہر اور اشیائے شعوری کے لئے — مطلقاً جن کا نہیں حق و حقیقت پہ مدار

یہ ظواہر ایک دن بالکل فنا ہو جائیں گے
رفتہ رفتہ خود حقیقت آشنا ہو جائیں گے

شکر ادا کرتا ہوں میں انساں کی ظنیات کا — ایک نامحسوس دنیا ہیں جو ہے کھٹکا ہوا

شکر یہ دھندلے خیالوں کا، کہ جن کے سامنے — مثلِ مجرم کانپتی ہے فطرتِ بزمِ فنا

وہ خیالات اپنی اصلیت میں چاہے کچھ نہ ہوں — ہیں مگر سرچشمہ اک پہلی حیاتِ تازہ کا

وہ حقیقی روشنی، وہ قوت و وجہ قیام — زندگی کی شورشیں بھی جن سے ہوں تسکیں فزا

وہ صداقت، جس پہ طاری ہو نہیں سکتا زوال — جس کو بے پروائی اور کو اس سے ہو اعتنا

جس پہ حاوی ہو نہیں سکتا کوئی طفل و جواں — جو خوشی کے دشمنوں سے بھی نہیں خوف آشنا

ہم پہونچ جائیں سکوں کی رَد میں گو کتنی ہی دُور — یہ سمندر غیرفانی موج میں ہے جلوہ زا

دیکھتے ہیں کھیلتے بچّوں کو ساحل پر مگن

سنتے ہیں آواز اُس پانی کی جو ہے موجزن

اے پرندو، ہاں خوشی کا راگ پھر چھیڑو اٹھو — بانسری پہ بھیڑ کے بچّوں کو اذنِ رقص دو

کیوں مسرت میں تمہاری ہم نہ ہو جائیں شریک — فصلِ گُل کے کیف سے رقصاں ہو تم مسرور ہو

چھن گئی مجھ سے ہمیشہ کے لئے وہ روشنی — گلشنِ ہستی میں مشکل اس کا لوٹ آنا ہی گو

حُسن کا لمحہ نہ واپس ہو تو اس کا غم نہیں — ہے جو باقی ہم جگائیں گے اُسی احساس کو

اولین ہمدردیوں میں جو ہیں قطعاً لازوال — اور اُن جذبوں میں پیدا دردِ انساں سے ہیں جو

اس یقین میں غیرفانی روح ہے بعد ممات — اور جو اس دور میں ہیں فلسفے کے ہم جلو

پیش گوئی کیوں ہی یہ ہوگی محبت کو شکست — اے پہاڑو، سبزہ زارو، آبشارو، جنگلو

میں نہیں غمگیں نہ میری حسرتیں مایوس ہیں

دل کی فطرت میں تمہاری قوتیں محسوس ہیں

کھو چکا وہ عیش میں، جو تم سے حاصل تھا مجھے — لیکن اب بھی عشرتِ احساس ہے میرے لئے

مجھ کو وہ چشمے پسندیدہ نظر آتے ہیں جو — میری بچپن کیطرح چلتے ہیں بل کھاتے ہوئے

طلعتِ معصوم اب بھی صبح نو کی ہے عزیز — اور وہ بادل جو ہیں سورج کی ضو میں ڈوبتے

ہیں یہ سب اس کے لئے سرمایۂ سنجیدگی
درسِ عبرت ہے فنائیت بھی انساں کی جسے

تجربہ میرا نیا ہے، ہے نیا انعامِ فکر
شکریہ دل کا، ملے ہیں زیست کی جس سے مزے

شکریہ اسکی خوشی، ہمدردیوں اور خوف کا
میں بھی یہ احساس کرتا ہوں انھیں جذبات سے

پذمریں اک پھول بھی مجھ کو ہے خلاقِ خیال
اس قدر گہرا تخیل جس پہ انساں رو سکے

بادۂ نو میں خمارِ بادۂ دوشینہ ہے
بزمِ فانی عالمِ ارواح کا آئینہ ہے

شہید

مجھے حجابِ شفق بھی کبھی چھپا نہ سکا
بہ ایں نمود سمجھ میں کسی کی آ نہ سکا

میں حکمراں ہوں زمانے کی ذہنیت پہ مگر
کسی کا ذہن مرے دل کا راز پا نہ سکا

منافقوں نے اُٹھائے ہزارہا طوفاں
جلائی شمع جو میں نے کوئی بجھا نہ سکا

مذاقِ سجدہ میں جب سر جُھکا دیا میں نے
تو کوئی فرشِ زمیں سے مجھے اُٹھا نہ سکا

طلوعِ صبح ہے میرے ہی خونِ رنگیں سے
فروغِ شام ہے میری بہارِ خونیں سے

سرمایہ دار اور مزدور

سرمایہ دار:۔

خستہ و مقہور اے مزدور اے مجبور و خوار
کیوں مرے آوازۂ عظمت سے گھبراتا ہے تو

تیری فطرت میں عنا ہے میری فطرت میں غنا
صاحبِ دولت ہوں میں مفلوک کہلاتا ہے تو

بزمِ عالم میں یہ تیری شورشیں ہیں سب فضول
سننے والا کون ہے، بیکار چلاتا ہے تو

تو یہاں پیدا ہوا ہے فاقہ مستی کے لئے
یہ غنیمت ہے اگر نانِ جویں کھاتا ہے تو

فکرِ دولت میں ہے روز و شب مرا ذہن و دماغ
جاگتا رہتا ہوں میں جس وقت سو جاتا ہے تو

تیری ہستی ہے زمانے میں کچلنے کے لئے
ذوف ہے انسان ہونے پر جو اتراتا ہے تو

تجھ کو معراجِ ترقی سے نہیں کچھ واسطہ
راستے میں رہروں کی ٹھوکریں کھاتا ہے تو

صنعتوں کا اور مشینوں کا یہاں موجد ہوں میں
اپنی صناعی کے نغمے بے محل گاتا ہے تو

تیری خوش حالی عنایت پر مری موقوف ہے
حیثیت سے کیوں زیادہ پاؤں پھیلاتا ہے تو

زندگی تیری مرے ایثار کی ممنون ہے
تیری رگ رگ میں مری دولت کا گاڑھا خون ہے

مزدور:۔

سچ کہا سرکار میں ایسا ہی ناہنجار ہوں
مجھ کو قسمت نے کیا ہے قابلِ عجز و نیاز

منفعل ہی مجھ سے کیا کیا فطرتِ انسانیت
معترف ہا ہے اس خطا کا خامہ قسمت طراز

آپ ہی میرے خدا ہیں، بس اگر ہوتا مرا
سجدے کرتا آپ کو اور آپ کی پڑھتا نماز

نسل سے فرعون اور شداد اور نمرود کی
کیا خبر تھی ہوں گے میرے عہد میں ابنائی ناز

مانگ لاتا میں خدا سے برزخِ مور و ملخ
ٹھوکروں میں آپ کی ملتی مجھے عمرِ دراز

کیا کروں انساں بنا کر فطرتِ تخلیق نے
کر دیا مجھ کو غمِ انسانیت سے سرفراز

لیکن اب فطرت مری صد شور و صد آہنگ ہی
انقلابِ تازہ کے نغموں سے ہا ہے معمور ساز

وقت آتا ہی کہ باطل ہو انانیت کا سحر
وقت آتا ہے کہ ہم رتبہ ہوں محمود و ایاز

وقت آتا ہی کہ سرمائے کی لعنت دور ہو
وقت آتا ہے کہ افشا فاقہ مستی کا ہو راز

میں غلامِ بے درم ہوں بندۂ مجبور ہوں
آپ کا ارشاد بر حق ہے، مگر بندہ نواز!

اب غلام اس قیدِ باطل سے نکالے جائیں گے
جسمِ استعمار میں مزدور ڈھالے جائیں گے

وطن کے ساز پر میرا گیت

وطن ہے جنتِ حسن و رنگ سے جنت نشاں میرا
کہو رضواں سے آئے، دیکھ جائے گلستاں میرا

اسی دنیا میں میرا تاج سورج بن کے چمکا ہے
عروج و ارتقا دیکھے ہوئے ہے آسماں میرا

یہیں بھٹکا ہے میرا کارواں تاریکیٔ شب میں
یہیں سے پھر سوئے منزل بڑھے گا کارواں میرا

یہیں ناقوس کے نغموں سے مجھ کو وجد آیا ہے
یہیں گونجا کیا ہے شورِ تکبیر و اذاں میرا

یہاں خود میں نے آئینِ سرفروشی کا بنایا ہے
اسی دنیا میں صدیوں ہو چکا ہے امتحاں میرا

تسلط ہے مرا ہر خار، ہر غنچے پہ، ہر گل پہ
ہر اک ڈالی ہے میری اور ہے ہر آشیاں میرا

وطن کو گرتے گرتے تھام لیں گے حوصلے میرے
حریفِ پیر سے کہہ دو ابھی دل ہے جواں میرا

میں ہر انساں میں سوزِ وطن کی آگ بھر دوں گا
وہیں جگنو اڑیں گے دل بھڑک اٹھا جہاں میرا

نظر آتی ہے روشن اپنی منزل مجھ کو ظلمت میں
ہے مستقبل کی بجلی نالۂ آتش فشاں میرا

مٹا بھی دیں تو اک دنیا نئی ایجاد کر دوں گا
کہ دنیا ہوں اک ذرہ نہ ہوگا رائگاں میرا

جو مشکل بن کے ٹھوکر آئے گی ٹھکرائی جائے گی
قدم ہوگا ضیا راہِ وطن میں جب رواں میرا

ہمنشینانِ کالج سے

جھوم کے ابر جانبِ محفلِ عام آگیا
جمع ہوئے سخن شناس لطفِ کلام آگیا

صحنِ چمن میں آج یہ کہتی ہوئی صبا چلی
مژدہ ہو میکشانِ علم، دور میں جام آگیا

مرکزِ اتصال پر بچھڑے ہوئے پھر آملے
وقتِ سکونِ روح کا لے کے پیام آگیا

اب نہ ملالِ جستجو، اور نہ گرمیٔ طلب
طائرِ فکر خود بخود پھر تہِ دام آگیا

منظرِ اوج و ارتقا اب ہے نظر کے سامنے
جلوۂ خلوت آشنا، تا در و بام آگیا

حدِ نگاہ تک تمام سمٹی ہوئی ہیں ظلمتیں
رہروِ صبح کرکے طے جادۂ شام آگیا

سر پہ ہے اپنے موجزن پرچمِ منزلِ حیات
جس کی تھی جستجو ہمیں پھر وہ مقام آگیا

تھیں جو فضائیں منتشر سب وہ سکوں نشاں ہوئیں
تازہ بہ تازہ نگہتیں نازشِ گلستاں ہوئیں

مژدہ ہو اہلِ انجمن پھر ہے صدائے نا و نوش
جام بکف ہے ہر طرف ساقیٔ معرفت فروش

دشمنِ غفلت و جمود ہے اسی میکدے کا فیض
جرعۂ علم و فضل سے کیجئے اکتسابِ ہوش

ختم ہوئے تھے چہچہے، بزمِ چمن تھی بے صدا
چھایا ہوا تھا اک سکوت، محفلِ نغمہ تھی خموش

پھر وہی گرمیٔ سخن، پھر وہی کیفِ انہماک
پھر وہی بارشِ نوا، پھر وہی خطبۂ سروش

ایک نوائے دل نواز پردہ کشائے سازِ راز
ایک صلائے سرمدی راہنمائے چشم و گوش

اے رفقائے بزمِ علم، وقت کی قدر چاہیئے
گود میں حادثوں کی ہی ہستیٔ اضطراب کوش

پھر یہ سکون یہ فراغ اور یہ فرصتیں کہاں
پھر وہی ہم ہیں اور وہی شورشِ دہر پُر خروش

آج کہ قصرِ علم میں فارغِ فکرِ راہ ہیں
طالبِ علم ہم نہیں وقت کے بادشاہ ہیں

ارشدؔ کو دیکھ کر

کمسن و معصوم ارشدؔ، مادیت سے بری
تیری خاموشی میں کامل ترجمانی ہے بھری

یہ نظر، یہ مسکراہٹ اور یہ محویتیں!
دیکھتا ہے تو رواقِ عرش کی صنعت گری

تو حقیقت سے ہے نزدیک اور باطل سے ہے دور
کیوں نہ پھر افرادِ عالم پر تجھے ہو برتری

شادمانی تیری جنت کا شگفتہ ایک پھول
تیری آزادی، خرام و خندۂ کبکِ دری

کاہش و آلام سے دنیا کے تو ہے بے نیاز
ہے یہی اک وقت جس میں ہے میسر قیصری

تابشِ شمعِ ازل ہے روح کی قندیل میں
کچھ فرشتے وجد کرتے ہیں تری تخئیل میں

۱؎ خلفِ مصنف

۱۹۳۸ء

صبحِ نوروز

مجھ سے نہ پوچھ کیا ہے سکون اور انبساط
مخصوص اپنی ساعتیں انسان کیوں کرے
میرے لئے وہ دن بھی حقیقت میں رات ہے
جس کو نہ صبح و شام ہوا احساسِ زندگی
جس وقت ہر نفس مرا گرمِ ستیز ہو
اک دورِ نو ہے لذتِ نو سے پھر آشنا
بجلی سے کہدو پھونک دے ہر لالہ زار کو

وہ لمحہ جس میں نام کو پژمردگی نہیں
پابندِ وقت و عہد، ملال و خوشی نہیں
جس میں کوئی فروغ، کوئی زندگی نہیں
وہ مستحقِ عشرتِ نوروز بھی نہیں
اُس وقت بے خودی بھی مری بیخودی نہیں
شکرِ خدا کہ درد و خلش میں کمی نہیں
آسودۂ بہار ابھی برہمی نہیں

جس وقت ہو خیال طبیعت میں زیست کا
نوروز ہے وہ لمحہ حقیقت میں زیست کا

وہ دن تری حیات کا عنوانِ خاص ہے
تیرا وہ دن ہی زیست میں سرمایۂ نشاط
وہ دن یقین کر، کہ ہے اک تیرِ حیات

جس دن خیال بے خبرِ انتشار ہو
جب روح پُر سکوں ہو، دل کو قرار ہو
جس دن ترا جمودِ خودی پُر شرار ہو

پیدا اگر اپنے دل میں نئے مہر و ماہتاب — جن سے حیاتِ ازسرِ نو آشکار ہو
اُس کی ہے صبح، اُس کا ہے نوروز اُس کا کیف — احساس سے جو قبلِ سحر ہمکنار ہو
کر قبضہ برگ و بار پہ یوں صورتِ شعاع — تیرا ہر اک باغ ہو تیری بہار ہو
ہے ہر نفس عروج، بتادوں تجھے یہ راز — شاید عروجِ نو کا تجھے انتظار ہو

دنیا میں عشرتِ نظر افروز ہے یہی
چھا جا مثالِ صبح کہ نوروز ہے یہی

خودی

ضیا اپنی ہستی مرے روبرو ہے — جدھر دیکھتا ہوں اُدھر رنگ و بُو ہے
اُٹھائے بلا میری احسانِ ساقی — اب اپنی شراب اور اپنا سبو ہے
میں انسان ہوں عظمتیں دیکھ میری — شفق ہے تری اور میرا لہو ہے
خودی نے مجھے بخشدی ہے خدائی — یہی میرے احساس کی آبرو ہے

یہاں میرا سکہ وہاں تیری شاہی
یہاں میں ہی میں ہوں وہاں تُو ہی تُو ہے

اگر دنیا میری ہو!

ایک مدت سے یہ دنیا کشتۂ بیداد ہے
واے مظلومی کہ ہر اک شاد کی ونا شاد ہے

موت کو ہی کامیابی زندگی ناکام ہے
پھول کھلتے ہیں مگر افسردگی انجام ہے

اہلِ عالم کو میسّر عشرتِ عالم نہیں
اس جہاں میں زخمِ دل کیواسطے مرہم نہیں

خالقِ فطرت کے کارندے ہیں سب مصروفِ خواب
انتظامِ بزمِ فطرت میں ہے پیدا انقلاب

دہر کی تاریکیوں میں حق پرستی کھو گئی
ظلم اُٹھا انگڑایاں لے کر صداقت سو گئی

الغرض اک دام ہے پھیلا ہوا اوہام کا
عالم خونخوار تشنہ ہے لہو کے جام کا

سوچتا ہوں جب کبھی تنہائی کے لمحات میں
ہوک سی اُٹھتی ہے میرے دل کے احساسات میں

ان جنوں اندیشیوں سے اے خدائے ذوالجلال
میرے دل میں اک نیا رہ رہ کے اُٹھتا ہے خیال

تو نے رکھدی ہیں بہت تنقید کی گنجائشیں
یہ نہ فرما، ذہنِ ناقص کی ہیں ناقص کاہشیں

کاٹ دیتا ہے گلا انسان جس معصوم کا
یا الٰہی تو ہی کیا خالق ہے اُس مظلوم کا؟

جس کو دو دو دن نہیں ملتا ہے ٹکڑا نان کا
یا الٰہی تو ہی کیا رازق ہے اُس انسان کا؟

جس کے جسمِ زار و لاغر پہ نہیں ہے ایک تار
یا الٰہی تو ہے کیا اُس بے نوا کا ذمہ دار؟

جس کو پیہم کرب ہے جس کی خوشی مفقود ہے
یا الٰہی تو ہی کیا اُس شخص کا معبود ہے؟

بیقرارِ صدمۂ لاوارثی ہے جو یتیم
یا الٰہی کیا ہے تو ہی اُس کا رحمٰن و رحیم؟

دو گھڑی بھی جس کا کھلنا خوشہ چیں کو شاق ہے
یا الٰہی تو ہی کیا اُس پھول کا خلاق ہے؟

گر اجازت ہو تو افشا آج میں کر دوں وہ راز
جس نے میری روح کو یکسر بنایا ہے گداز

میرے ہاتھوں میں گر آ جائے اس دُنیا کی باگ
لوٹ کر آ جائے پھر ناشاد بیوہ کا سُہاگ

میرے ہاتھوں میں گر ہو تیری دنیا کا نظام
ہو یتیمی اور اسیری کا نہ اس عالم میں نام

میرے دورِ حکمرانی میں جہاں مسرور ہو
نشۂ نو بادۂ ہستی سے دُنیا چور ہو

مزرعِ ہستی کا حاصل ہو نشاطِ جاوداں
بڑھ سکے حدِ جوانی سے نہ یہ عمرِ رواں

اس طرح ترتیب دوں میں اک نظامِ کائنات
عشرتِ جاوید کو ہو میری دنیا میں ثبات

وسعتِ افلاک پہ لہرائے یوں پرچم مرا
چاند سورج سر جھکائیں دیکھ کر دم خم مرا

زندگی کے نام پر میں موت کو دیدوں شکست
انتظامِ عیش کر دوں اور غم کا بند و بست

میری دنیا میں نہ ہو فقر و فلاکت کا گذر
سب کو دیدوں جاہ و حشمت سب کو دیدوں کرّ و فر

یاس و حسرت کی بلائیں ٹال دوں للکار کر
بزمِ عالم سے نکالوں غم کو ٹھوکر مار کر

میرے قبضے میں جو تو دیدے جہاں کا انتظام — میں بتاؤں کس طرح اس کا کروں گا اہتمام؟

چھین لوں گا فطرتِ انساں سے میں جذباتِ جنگ — پھینک دونگا توڑ کر یہ خنجر و تیر و تفنگ

ہوگا ہر انسان کو دنیا میں ہر انساں کا پاس — عالمِ ہستی کی رکھوں گا محبت پر اساس

میری دنیا میں رہے گا ہر نفس مسرور و شاد — یعنی سب اپنی تمنا پائیں گے حسبِ مراد

ایک ہی عالم رہے گا دہر کے جذبات کا — صبح کی ضو سے بدل دونگا اندھیرا رات کا

تا ابد آنے نہ دونگا میں خزاں کو باغ میں — جنتیں بھر دوں گا لالے کے فروزاں داغ میں

امتیازِ قوم و ملت بھی مٹا ڈالوں گا میں — دہر کی ہر قوم کو انساں بنا ڈالوں گا میں

ایک ہی مذہب کے پیرو ہوں گے اربابِ جہاں — ایک ہی چشمے سے سب سیراب ہوگا کارواں

جب یہاں جھگڑے نہ ہونگے لطفِ جنت آئیگا
مضطرب انسان اس دنیا میں تسکیں پائیگا

سقوطِ آسٹریا

غلامی اپنی حد پر جب پہونچتی ہے غلاموں میں
تو آزادی پھر اسکو جذب کرلیتی ہے لمحوں میں

سرودِ روح

جس وقت فلک سو جاتا ہے جس وقت زمیں سو جاتی ہے
جب رات خنک ہو جاتی ہے اک نغمہ روح سناتی ہے

اک نغمہ جیسے حوروں کی آنکھوں سے بارش ہوتی ہے
اک نغمہ جیسے کوئی دوشیزہ پہ ہجر کی ماری روتی ہے

اس نغمے کی رنگینی سے روحانی کلیاں چنتا ہوں
سنتا ہوں اور سر دھنتا ہوں سر دھنتا ہوں اور سنتا ہوں

وہ روح کا نغمہ جب میرے جذبات پہ طاری ہوتا ہے
اک بھینا بھینا راگ مری رگ رگ سے جاری ہوتا ہے

کچھ روحانی الفاظ سمجھ میں آتے ہیں رہ جاتے ہیں
کچھ دریا سے لہراتے ہیں کچھ آنسو سے بہہ جاتے ہیں

دنیا کا ہوش نہیں رہتا وہ عالم ایسا ہوتا ہے
محسوس نہیں ہوتا مطلق دل ہنستا ہے یا روتا ہے

وہ نغمہ جس کے میٹھے میٹھے بول قیامت ہوتے ہیں
وہ نغمہ جس کے نورانی الفاظ بشارت ہوتے ہیں

کہتا ہے کوئی روح کے پردے سے اے انساں ہوش میں آ
اس مادی ظلمت خانے کی خلوت سے نکل اور جوش میں آ

مدت سے یہ چاند اور تارے تیری پستی پہ ہنستے ہیں
جو تیرے لئے مخلوق ہوئے تجھ پہ آوازے کستے ہیں

تجھ کو روحانی دنیا سے آگاہی دے کر بھیجا تھا
تو بن بیٹھا محکوم، دماغِ شاہی دے کر بھیجا تھا

بھیجا تھا تجھے اس دنیا میں تائیدِ فطرت کرنے کو
خالق سے محبت کرنے کو مخلوق سے اُلفت کرنے کو

تو الفت اور محبت کے سارے جذبات گنوا بیٹھا
جو دولت تجھ کو بخشی تھی وہ دولت آہ لٹا بیٹھا

حرص اور غلامی اور غفلت، یہ روحانی سامان نہیں
تو ان سامانوں میں گم ہے یہ انسانوں کی شان نہیں

انسان اگر کہلاتا ہے مشرب اپنا روحانی کر
اس دنیا میں بے نام ہو اس دنیا میں سلطانی کر

بغاوت

رگِ انسانیت میں جب لہو کو جوش آتا ہے
دماغِ آدمیت جب بگڑ کر لوٹ جاتا ہے

ہوائیں جبر کی چلتی ہیں جب رنگیں فضاؤں میں
بجائے بوئے گل جب خاک ہوتی ہے ہواؤں میں

شکم پر اپنے پتھر رکھ کے جب مزدور سوتا ہے
جب انسانوں میں سرمایہ گری کا زور ہوتا ہے

شرابِ ناب کے جب دور چلتے ہیں امیروں میں
جب آزادی بھی آ کر قید ہوتی ہے اسیروں میں

جب اپنی حد سے بڑھ جاتا ہے استبداد دنیا میں
بپا ہوتا ہے شورِ نالہ و فریاد دنیا میں

کسانوں میں نہیں رہتی ہے قوت ہل چلانے کی
بدل جاتی ہے جب یوں ناگہاں حالت زمانے کی

بغاوت آگ بن کر گوشے گوشے سے ابلتی ہے
صدائے "الاماں" ہستی کے سینے سے نکلتی ہے

گرا دیتی ہے بجلی خرمنِ سرمایہ داری پر
برس پڑتی ہے بیجا قوتوں کی جبر کاری پر

بلندی انتہائے عجز کے پہلو میں سوتی ہے
"سرفرازی" پر آخر سرکشی کو فتح ہوتی ہے

جوشِ عمل

وہ جذبۂ عمل جو مرے دل میں راز تھا
لایا ہوں انجمن میں نمایاں کئے ہوئے

میرے لئے یہ دہر ہے میدانِ کارزار
اپنی ہر اک روش کو پریشاں کئے ہوئے

فریاد، ملتفت نہیں اب تک خدائے درد
مدت ہوئی گذارشِ درماں کئے ہوئے

آیا ہوں شعلہ بار بساطِ جمود پر
برقِ عمل سے چہرہ فروزاں کئے ہوئے

بیٹھا ہوں انتظارِ نواہائے ساز میں
اپنے نفس نفس کو غزلخواں کئے ہوئے

لے آؤ انجمن میں جمود و خمود کو
نشتر سے اپنے چھیڑ دوں اُنکے وجود کو

یہ کہہ رہا ہے محفلِ فطرت کا ارتقا
دنیا میں ہر خیال ہے تکمیل کے لئے

ممکن نہیں بغیرِ عمل انبساطِ زیست
گنجائش نہیں کسی تاویل کے لئے

ہے زیست کی رگوں میں ضیا اسکی ضوفشاں
یہ روشنی ہے روح کی قندیل کے لئے

جذباتِ نو سہی کچھ نئے جذبات ڈھونڈ لے
افسانۂ قدیم کی تحلیل کے لئے

صوتِ عمل کے شور سے ہلچل ہے دہر میں
اُٹھ تو بھی اس پیام کی تعمیل کے لئے

اے نوجواں عمل کے لئے شعلہ خیز ہو
منظور زندگی ہے تو گرمِ ستیز ہو

میری فطرت

کیوں گریزاں مجھ سے ہے اے پھول میں گلچیں نہیں
فطرتاً معصوم آزاری مرا آئیں نہیں

باغ میں آزاد ہے تیری شگفت و تازگی
میں تجھے پابند کرلوں اے گلِ رنگیں نہیں

تیرے نظارے سے کھلتا ہے مرے دل کا کنول
اس تری آزادیٔ رنگیں سے میں غمگیں نہیں

میری بے آزار فطرت قابلِ تقلید ہے
ہمتِ عالم میں یہ رفعت نہیں تمکیں نہیں

میرا مسلک ہے نیا، ہر حال میں شاداں ہوں میں
فطرتِ عالی پر اپنی آپ ہی نازاں ہوں میں

عمر بھر قیدِ غلامی میں نہیں جینا مجھے
سعیٔ آزادی میں ہے خونِ جگر پینا مجھے

شورشِ نظارہ سے نظریں پریشاں ہو گئیں
کاش کر دے قسمتِ خوددار نابینا مجھے

مجھ کو ہنگاموں میں رہتی ہے سکوں کی جستجو
خامشی کا درس ہے ہر قلقلِ مینا مجھے

پھونک بیٹھا خرمنِ ہستی کو سوزِ بے محل
حاصلِ وارفتگی ہیں طور اور سینا مجھے

ذرہ ذرہ ہے جہاں کا آئینا میرے لئے
پردۂ ظلمت میں پنہاں ہے ضیا میرے لئے

کر سرشتِ دل سے پیدا الہتابِ زندگی　ظلمتوں میں بن کے آجا آفتابِ زندگی
ہو گئی بے کیفیوں سے محفلِ عالم خراب　میکدہ بن اور برسا دے شرابِ زندگی
زندگی کا لطف یہ ہے ہو نہ تخریب آشنا　حور کی دوشیزہ عصمت ہو شبابِ زندگی
زندگی کا راز یہ ہے جز و سے الفت نہ کر　بے نیازِ خار و گُل ہے کامیابِ زندگی
زندگی کے ساز سے آتی ہے ماتم کی صدا　چھیڑتا ہے جب کوئی چھپ کر ربابِ زندگی

میں نہیں موزوں نشاطِ بزمِ رنگیں کے لئے
میری خودداری ہے وحشت اہلِ آئیں کے لئے

حسرتِ ناتمام

تمنا تھی کہ رازِ دل کبھی اپنا بیاں کرتا　شکستِ آرزو کو بھی شریکِ داستاں کرتا
دمِ رخصت بھی نظارے کی حسرت رہ گئی باقی　نگاہِ واپسیں سے ایک افسانہ بیاں کرتا

مجھے موقع جو مل جاتا ضیاؔ شعلہ نوائی کا
میں خاکِ دل کے ہر ذرے کو خورشید آشیاں کرتا

۹۷۶۹

سُنہری زندگی

اپنا اثر دعائیں میری دکھا رہی ہیں
دریا مسرتوں کے مجھ پہ بہا رہی ہیں

چھایا ہوا ہے سر پر رنگین ایک بادل
شہرت کی شوخ کرنیں چھن چھن کے آ رہی ہیں

ہونٹوں پر اک تبسم چہرے پہ شادمانی
کیفِ وفا سے نظریں خود مسکرا رہی ہیں

سرمستیاں جنوں کی میری نشاط میں ہیں
مطلق سکون بنکر جو دل پہ چھا رہی ہیں

میں بحرِ زندگی میں کشتی چلا رہا ہوں
اُلفت بھری نگاہیں رستہ بتا رہی ہیں

ہو دَور میں ہمیشہ اُلفت کا جام یارب
ٹھہرے رہیں یہیں پر یہ صبح و شام یارب

احساس ہے جہاں میں تدبیرِ کامرانی
اس عہد میں ملا ہے یہ درسِ زندگانی

ہیں حسن اور محبت جام و شراب گویا
ایک جرعہ حقیقت ہے میری شادمانی

جذبات کا ہے ہر سو اک آبشار جاری
دریا بنی ہوئی ہے تخیل کی روانی

یہ میرے دل میں یارب چنگاریاں سی روشن
یہ نور کا عالم یہ جذبۂ نہانی!

ہر غنچۂ زندگی کا پھوٹا بہار بن کر
یہ پُرشباب منظر پھولوں کی یہ جوانی!

کامل نشاط بن کر دل مسکرا رہا ہے
یہ میرا دورِ زرّیں کیا جگمگا رہا ہے

نوجوانو!

کیفِ نظر سے سب کو فطرت پرست کر دو
دنیا کے نوجوانو، دُنیا کو مست کر دو

رازِ حیات سے تم آگاہ کیوں نہیں ہو
آگاہ ہو تو خضرِ ہر راہ کیوں نہیں ہو

تم خود ہو اپنی منزل تم خود ہو اپنا جادہ
کیوں فکرِ راہبر میں بیٹھے ہو سر فتادہ

سر گشتۂ تعیّن ہے کارواں تمہارا
ورنہ زمیں تمہاری اور آسماں تمہارا

جب قوتِ نہاں سے تدبیر کام لیگی
دنیا غلام بن کر قدموں پہ آ گرے گی

ہیں حسن اور محبت فطرت کی ایک طاقت
چاہیں تو فتح کرلیں دونوں جہاں کی وسعت

فطرت نے حسن اپنا انساں میں بھر دیا ہے
معمور اس کے دل کو الفت سے کر دیا ہے

ان قوتوں سے انساں جس روز کام لے گا
دامانِ عرشِ رفعت چٹکی میں تھام لے گا

شاعر

سنہ ۱۹۳۴ء

شعر ہے اک عشرتِ بادہ فشاں میرے لئے
شاعری ہے اک نشاطِ جاوداں میرے لئے

کوہساروں پہ ہے میرے واسطے طاری سکوت
آبشاروں سے ہے موسیقی رواں میرے لئے

نغمہ بن کر چھا رہا ہوں وسعتِ کونین پر
یہ زمیں میرے لئے ہے آسماں میرے لئے

گلستاں کے پھول ہیں میرے لئے مینا و جام
دشت ہے اک نغمہ زارِ شعر خواں میرے لئے

میں نے دیکھی ہی نہیں تاریکئ شامِ زوال
یعنی یہ دنیا ازل سے ہے جواں میرے لئے

ابتدا سے ہے مری فطرت شکارِ حسن و عشق
سائکی کا تیر، کیوپڈ کی کماں میرے لئے

تابشِ ہستی مرے اشعار سے ہے ضَو فگن
مہر و مہ میرے لئے ہیں کہکشاں میرے لئے

ہر ادا ہر عشوۂ تخلیق کا ماہر ہوں میں
محفلِ کونین کا اک نوجواں شاعر ہوں میں

کیفیت ہوتی ہے طاری جب مرے جذبات پر
کوند کر گرتی ہے اک بجلی سی احساسات پر

عکس سے میرے ہی دنیا کو درخشانی ملی
چاند سورج بن کے میں رخشاں ہوا ذرات پر

کوہِ غم سر پر اُٹھا لیتا ہوں میں لیکن کبھی
میرے دل میں چوٹ لگتی ہے ذرا سی بات پر

قوتیں میری کوئی قوت مٹا سکتی نہیں
نور و ظلمت کیطرح طاری ہوں میں دن رات پر

میرے ساغر سے چھلکتی ہے مئے فطرت مدام
منحصر میری طرب کوشی نہیں برسات پر

ترجمانِ رازِ ہستی ہے مری فکرِ بلند
حکمرانی ہے مری دنیائے محسوسات پر

رنج و غم دو مختلف نغمے ہیں میرے ساز کے
رقص فرما بزمِ ہستی ہے مرے نغمات پر

حسبِ خواہش اک فضا اپنی بنا لیتا ہوں میں
جب اُمنگ اُٹھتی ہے میرے دلمیں گا لیتا ہوں میں

گوشۂ تنہائی سے اک ذوق لایا ہے مجھے
رازِ فطرت کھول کر کچھ آج کہنا ہے مجھے

میں رہا ہوں بزمِ ہست و بود پر مصروفِ غور
چاند اور تاروں نے محوِ فکر دیکھا ہے مجھے

محویت میں مادیت مجھ کو چھو سکتی نہیں
عالمِ روحانیت کا درک اتنا ہے مجھے

بیخودی میں امتیازِ جزو و کل جاتا رہا
غور کرنے کے لئے قطرہ بھی دریا ہے مجھے

اس تماشا گاہ میں عالی نظر رکھتا ہوں میں
محشرِ کونین بھی مطلق اک تماشا ہے مجھے

منتشر اجزائے ہستی میں ہے رازِ انحطاط
اجتماعِ بزمِ فطرت نے سکھایا ہے مجھے

شورشِ عالم کو میں سمجھا ہوں جنگِ زرگری
رزمگاہِ ظاہر و باطن یہ دنیا ہے مجھے

ہیں یہ احساسات جنکو شعر میں بھرتا ہوں میں

اور انھیں جذبات میں جیتا ہوں میں مرتا ہوں میں

شاعری میری حقیقت میں مرا پیغام ہے
اس لئے پیغمبرِ فطرت بھی میرا نام ہے

بے خودی میں رازِ فطرت کھول دیتا ہوں کبھی
میرے ہر ہر لفظ کے پردے میں اک الہام ہے

رگ زنِ تحریک ہوں خاموشیٔ افراد میں
بحر میں، طوفان کی تخلیق میرا کام ہے

خالقِ فطرت نے اک مقصد سے بھیجا ہے مجھے
یوں ہر اک لحظہ مرے پیشِ نظر انجام ہے

منزلِ مقصود پر فائز ہو میرا کارواں
زندگی کی صبح سے ہی مجھ کو فکرِ شام ہے

سر بجیبِ فکر اکثر سوچتا رہتا ہوں میں
مشربِ انسانیت کیوں اسقدر بدنام ہے؟

ہوشیار اے رہروِ صحرائے ہستی ہوشیار!
ہر طرف پھیلا ہوا حرص و ہوس کا دام ہے

سب فریبِ ذہنیت ہیں رسم کیا اوہام کیا
دَورِ محسوسات میں تخصیصِ خاص و عام کیا

آہ وہ عالم کہ یہ دنیا نہ تھی مصروفِ خواب
آہ وہ عہدِ جواں، عالم تھا فطرت کا جواب

زندگی پُر کیف تھی انسان بھی مسرور تھا
بے خودی کا وہ زمانہ، بے نیازِ احتساب!

زندگی میں یک بیک ہیجانِ نو پیدا ہوا
ہو گئی کم بخت یہ ہستی اسیرِ انقلاب

بربریت آ گئی انسانیت کے بھیس میں
جس نے وحشت خیز چھیڑا بزمِ فطرت میں رباب

خود غرض انسان بن بیٹھا جہاں میں حکمراں
لُٹ گیا عینِ خودی میں ساری محفل کا شباب

مقصدِ خلقت ہی پر مجرومیاں طاری نہ تھیں
مقصدِ انسانیت بھی ہوگیا ناکامیاب

نشترِ احساس سے مجروح ہوجاتا تھا میں
دیکھتا تھا دور سے جب بزمِ عالم کو خراب

اس قدر ہمدرد جب انسان کا دیکھا مجھے
شاعری تفویض کی فطرت نے اور بھیجا مجھے

اب مرے نغموں سے پیدا ہے نوائے زندگی
اب مرا ہر ہر نفس ہے ناخدائے زندگی

موت کی بیداد فرمائی پہ ماتم تابکے
میرے سازِ فکر سے سُن نغمہ ہائے زندگی

میری ہی نظموں سے ہے نظم و نظامِ کائنات
میرے ہی اشعار ہیں نشو و نمائے زندگی

ہے مرے ہونے سے سب کچھ میں نہیں تو کچھ نہیں
زندگی میرے لئے ہے میں برائے زندگی

زندگی کا آج تک مقصد نہیں سمجھا کوئی
مجھ کو فطرت نے کیا ہے آشنائے زندگی

چند تخریبی عناصر جزوِ ہستی بن گئے
زندگی ہے موت کی تصویر ہائے زندگی!

تو ابھی پابستہ آب و گل او ہام ہے
لے اُڑی اقوامِ عالم کو ہوائے زندگی

زندگی بنتی ہے کیونکر تجھ کو سمجھاؤں گا میں
آ میرے پاس آ، حدیثِ راز دہراؤں گا میں

متحد ہوکر نئی اک زندگی پیدا کریں
اہلِ عالم آؤ ہم سب ملکر ایک نالا کریں

اپنی آوازوں کو بھردیں ہم خلا میں عرش تک
محشرِ ہنگامہ ہستی کو آسودا کریں

خلقتِ انساں کو ہو انسان پر خود افتخار
مقصدِ تخلیق کو ہم اس طرح پورا کریں
محفلِ عالم کا کوشش سے بدل ڈالیں نظام
ظلم و استبداد کی دنیا تہ و بالا کریں
ذرے کو خورشید بن جانے کا پھر پیغام دیں
جو ابھی ناچیز قطرہ ہے اُسے دریا کریں
دہر کی ہر قوم کو انسانیت کا دیں سبق
گوشے گوشے میں وفا و مہر کا چرچا کریں
بھول جائیں عہدِ ماضی کا ہر اک سود و زیاں
حال کی دولت سے مستقبل کا کچھ سودا کریں

کون ہے تیار شعریت نمائی کے لئے؟
کس قدر بندے ہیں شاعر کی خدائی کے لئے؟

سلطانِ شہیدؒ

رات کا پُرہول سناٹا فضائیں خوفناک
وہ خروشِ مرگ قرنا کی صدا کا اشتراک
نامِ آزادی اندھیروں میں تھا جب کھویا ہوا
آہ جب غفلت میں تھا ہندوستاں سویا ہوا
بڑھ رہا تھا رفتہ رفتہ جب لڑائی کا فشار
اُڑ رہے تھے دُور تک گھوڑوں کی ٹاپوں سے شرار
آسماں جب کاروانِ شب کی غمخواری میں تھا
جب دلِ ہندوستاں غیروں کی دلداری میں تھا
اس غلام آباد کے اے اوّلیں احساس مند
اے شہادت گاہِ حریت کے مردِ سربلند
آستاں پر تو نے آزادی کے سر خم کر دیا
خون سے مردانگی کے سُرخ پرچم کر دیا

ذکر تیرا آبروئے ملّتِ ناشاد ہے
یاد تیری عبرتِ دورِ غلام آباد ہے

سالارِ کارواں

چلتے چلتے تھک گیا تھا کاروانِ زندگی
پُر غبارِ کسل تھی موجِ روانِ زندگی

شام کی تاریکیوں نے پھیل کر چاروں طرف
جب مکدر کر دیا تھا گلستانِ زندگی

صبح کا تارہ جبینِ حسن پر اک داغ تھا
باعثِ نزہت نہ تھا جب آسمانِ زندگی

حسن کی معصوم خلوت میں نہ تھا پایاں اسکو
عشق کے سجدے تھے ننگِ آستانِ زندگی

عالمِ ہستی پہ جب تھی موت سی چھائی ہوئی
جب جمود و کسل سے تھا امتحانِ زندگی

زندگی مضرابِ دل کی چوٹ جب کھاتی نہ تھی
روح کی گہرائیوں سے جب صدا آتی نہ تھی

ہر طرف گمراہیٔ غفلت کی تھیں کچھ بدلیاں
نالہ خیز و اشک بار و بیقرار و نوحہ خواں

قافلے نے آسماں سے چیخ کر شکوہ کیا
کاروانِ خستہ ہے جویائے میرِ کارواں

ایک "جگنو" جادۂ منزل میں تھا آوارہ سر
کوندتی تھیں خامشی میں رات کی جب بجلیاں

حسن کو تھی اپنی محفل میں تلاشِ ہم مذاق
عشق کو تنہائی میں تھی جستجوئے رازداں

حسن غمگیں تھا کہ بے کیفی بغیرِ عشق ہے
عشق روتا تھا کہ ہے بے حسن پھیکی داستاں

یہ نوائے درد سُن کر آسماں تھرّا گیا
گردشیں فریاد نے یوں دیں کہ چکر آ گیا

دے کے جنبش سازِ ہستی کو پرِ جبریلؑ سے
اک نیا نغمہ کیا پیدا نئی تخئیل سے

شعلہ سنجی دستِ فطرت نے اُسے تفویض کی
چھین کر آتش نوائی صورِ اسرافیلؑ سے

ذہن اسکا کوثر و تسنیم میں ڈھالا گیا
سوزِ رنگیں اُس نے پایا عرش کی قندیل سے

دردِ اُلفت کوٹ کر سینے میں اُسکے بھر دیا
پھر مکمل کر دیا جذبات کی تکمیل سے

ایک وہانِ مجسّم بزمِ معنیٰ سے اُٹھا
فائزِ ترتیب حُسن و عشق کی تحلیل سے

انقلاب افگن ہوا تصویر کا رُخ پھیر کر
چھا گیا وہ قلبِ عالم پر فضا کو گھیر کر

ہمنوائے روح وہ ممتاز اک انسان ہے
وہ مجسّم شعر ہے علم و ادب کی جان ہے

تشنہ کامانِ ادب کے واسطے موجِ حیات
سرِ محفل کے لئے وہ آگ کا طوفان ہے

عہدِ حاضر کے لئے اک تازیانہ برق ریز
ابر کے نغموں میں پنہاں اسکی دلکش تان ہے

کوہ پر استادہ آگاہِ رموزِ کائنات
فی الحقیقت ہر نفس میں اسکی اک وِجدان ہے

اُس کے ہر پیغام میں پنہاں ہی الہامِ سروش
رفعتِ تخئیل سے بالاتر اُس کی شان ہے

حشر ہے اُس کی نوا وہ خود سراپا صور ہے

آج اُس کے دم سے دنیا روشنی ہے نور ہے

اُس کے نغمے گونجتے ہیں رفعتِ کہسار میں — زندگی پھونکی ہوا اُس نے دشت میں گلزار میں

پھر سکوں ہے آج "جگنو" کی بھی آوارہ سری — اب وہ خود رہبر ہے اپنے جادۂ ہموار میں

حسن ملجائے سکوں ہے آج اس کے فیض سے — عشق ہے ڈوبا ہوا کیفیتِ سرشار میں

اُس کی ہر رنگیں نوائے زندگی افروز سے — روح آتی ہے نظر ہر پھول میں ہر خار میں

جنگ کے میداں میں نغمے رجز خواں سکے ہیں — اس کے جوہر رقص فرما خونچکاں تلوار میں

منزلت اس کی ابھی دنیا نے سمجھی ہے کہاں — سینکڑوں جلوے نہاں ہیں پردۂ اسرار میں

اے ضیا سیماب وہ پیغمبرِ اسرار ہے

رہنما ہے رہبر ہے، قافلہ سالار ہے

ہر ساز میں آہنگ میں پنہاں ہوں میں

ہر سنگ میں ہر رنگ میں پنہاں ہوں میں

شاعری اور شہریاری

شہریاری قوتِ انساں کی ہے بے جا نمود — شاعری کی منزلِ اُلفت سے ملتی ہیں حدود

شہریاری چاہتی ہے ساری دنیا لوٹ لے — شاعری کا ہے تقاضا روشنی دنیا کو دے

شہریاری سے سیاست کو ملی ہے زندگی — جذبۂ انسانیت کی ترجماں ہے شاعری

شہریاری شخصیت کی قوتوں کا نام ہے — شاعری اس شخصیت سے جنگ کا پیغام ہے

شہریاری یہ کہ دنیا نیند میں سرشار ہو — شاعری کا اقتضا یہ، آدمی بیدار ہو

شہریاری فطرتاً انسان تک محدود ہے — اس سے آگے راستہ اس کے لئے مسدود ہے

عالمِ ظاہر پہ رہتی ہے نگاہِ شہریار — روح کی گہرائیوں تک اس کا مشکل ہی گذار

اور شاعر ماورائے رفعتِ انسانیت — باندھتا ہے عرش پر گہوارہ روحانیت

شہریاری پست کرتی ہے جو دل کے ولولے — شاعری بڑھ کر لگا لیتی ہے سینے سے اُسے

شہریاری نفرت و نخوت کا ایک مسموم جام — شاعری اخلاق اور انسانیت کا احترام

شہریاری جسمِ انساں پہ ہے داغِ خودسری — شاعری اس داغ کے دھونے کو موجِ کوثری

شہریاری رنگ و بو، لعل و گہر اور رنگ و تاج — شاعری تاروں کلی جوہر اور پھولوں کا مزاج

زندگی کے ساز پر بجتے ہیں دونوں کے رباب
ایک ناقص چیخ ہے اور اک تبسم کامیاب

شہریاری کا توازن شاعری سے ہم نشیں
ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں باقی کچھ نہیں

شہریاری ہستیٔ انساں پہ مطلق جبر ہے
شاعری اس قہرمانِ قیصری کی قبر ہے

تضمین بر شعر سیمابؔ

کبھی مجھے بھی میسر تھی عشرتِ پیہم
تھی میرے نغموں سے تخلیقِ ساز و بربط و چنگ

اور آج روح ہے محرومِ عشرتِ آزاد
ہے صبح و شام بھی میری اسیرِ صد نیرنگ

مزارِ ہستی پہ اب یوں پڑا ہوا ہوں میں
فسردہ پھول ہو جس طرح جس میں بُو ہو نہ رنگ

حوادثاتِ زمانہ کی یہ نوازش ہے
نہ کوئی حوصلہ باقی ہے نہ لمیں اب اُمنگ

میں دیکھتا ہوں کہ ہر صبح پھول کھلتے ہیں
مرے لئے ہیں مگر سب خوفناک نہنگ

میں یوں جراحتِ یکسر ہوں دردمندی سے
مجھے ہے لمسِ ہوا پر گمانِ ضربتِ سنگ

جہانِ غم سے ہے وابستہ میری روحِ حزیں
"نوائے درد سے معمور ہے مرا آہنگ"

"تلاش کر نہ مسرت مرے فسانوں میں"

نغمۂ کامرانی

(انٹرمیڈیٹ کے نتیجۂ امتحان کی نویدِ کامیابی سُن کر)

اُٹھا کر اک طرف رکھ دے الم کا ساز اے مطرب
کوئی نغمہ الاپ ایسا کہ جو محفل پہ چھا جائے

مسرّت کامرانی عیش و عشرت اور تسکیں کی
زمیں سے گونج کر عرشِ معلّٰی تک صدا جائے

بہت دن تک ہم آزردہ رہے غم کے ترانوں سے
خوشی کا راگ ایسا چھیڑ جو دل کو جگا جائے

وہ جاگ اُٹھیں کہ جن پر ہے جمود و بے حسی طاری
جو ہیں ناآشنائے خواب اُن کو نیند آ جائے

ہمارا قافلہ آسودۂ منزل نہ ہو جب تک
ترے نغموں میں پنہاں ہو کے آوازِ درا جائے

خبر دی ہے کسی نے امتحاں میں کامیابی کی
ادا اُس کے کرم کا شکریہ کیوں کر کیا جائے

مجھے جس نے کیا لذت شناسِ دردِ عالم میں
اُسے تسکین دینا جب اِدھر تو اے صبا جائے

اِدھر آؤ فرشتو آستانِ رب پہ جھک جائیں
نہ روکے کوئی سیدھی عرشِ اعظم تک دعا جائے

الٰہی محفلِ ظلمت کو معمورِ ضیا کر دے
سفینے کو شبِ ہستی میں ساحل آشنا کر دے

آغا حشر کاشمیری

بزمِ عالم میں وہ کیفیاتِ رنگ و بُو نہیں
رونقِ ایوانِ گیتی آج شاید تو نہیں

آہ کیا تو پُر سکوں ہے قبر کی آغوش میں
چین کیونکر آ گیا اس محشرِ خاموش میں؟

سرمدی نغمات سے اب دل کو تڑپائیگا کون؟
اب ستارے آسمان سے توڑ کر لائیگا کون؟

مجلسی لعنت پر اب تنقید فرمائے گا کون؟
اور اُسے رنگین پیرائے میں سمجھائے گا کون؟

آہ اب کس سے سُنیں گے آتشیں نغمات ہم
آہ اب کس سے کہیں گے اپنے احساسات ہم

ہند کی دوشیزہ دیوی کو دیا سادہ لباس
تیرے ہی پُرکیف نغموں نے بجھائی دل کی پیاس

مغربی تہذیب میں ڈوبا ہوا تھا ہر جواں
مشرقی اطوار سے بیزار تھا ہندوستاں

تو نے اپنے دل کی چنگاری سے بھڑکائی وہ آگ
نغمۂ مشرق سے دبا کر رہ گیا مغرب کا راگ

سازِ تیرا آتشیں آواز طوفانی تری
حشر تک یاد آئے گی وہ حشر سامانی تری

تو کہ خود سوسائٹی کی قید سے آزاد تھا
عیش بندوں کے لئے طوفانِ برق و باد تھا

دُور یوں سیرۃ فروشی کی تباہی تو نے کی
عالمِ رندی میں بھی یادِ الٰہی تو نے کی

وہ ترے الفاظ کی رفعت میں معراجِ ادب — وہ ترے افکار میں طوفانِ امواجِ ادب

روح میں گھر کرنے والی تازہ ترکیبیں تری — وہ بہارِ گوش وہ رنگین تشبیہیں تری

عشق و الفت میں تری فطرت کی وہ سرشاریاں — وہ ترے ہونٹوں کی جنت آفریں گل کاریاں

مجلسِ تمثیل کی برسوں صدارت تو نے کی — شاعری میں خدمتِ افرادِ ملت تو نے کی

دل جگر ترے لطائف خیز و نزہت بار تھے — مرتے مرتے حسن و موسیقی ترے مختار تھے

تو نے جدت میں متانت کو دکھایا ڈھال کر — خاک کو صندل بنایا اپنا پر تو ڈال کر

تھی سیاسی عبرت و اصلاح کی ہستی تری — بر بنائے مصلحت گویا تھی سرمستی تری

تذکرہ ہے آج تیری موت کا حباب میں — "حشر آسودہ ہے موجِ محشرِ پنجاب میں"

۱۳ ھ ۵ ۴

ایک دن ملنا ہے پھر روزِ قیامت ہی سہی
داد لوں گا حشر میں اے حشر اس نظم کی

اقبال سے خطاب

کوئی یہ اقبال سے جاکر ذرا پوچھے ضیا
مدتوں سے کیوں تری بانگِ درا خاموش ہے

ایک عرصہ ہو گیا نغمے نہیں فردوسِ گوش
تشنۂ سازِ لبِ اقبال ہر اک گوش ہے

بزمِ ہستی میں وہی اب تک ہے پیدا انتشار
خود ہی مسلم مضطرب ہے خود مصیبت کوش ہے

اس گلستاں میں مناظر کا وہی ہے رنگ بھی
دیکھنے والا فریبِ دید میں مدہوش ہے

خوں شہیدوں کا رواں ہے جنگ کے میدان میں
اور غازی کی زباں پر نعرۂ پُرجوش ہے

کیا قلم جولانیاں اپنی دکھا سکتا نہیں؟
وہ قلم جس کی نوا بھی صُور کی ہم دوش ہے

کیا ترے جذبات کے شعلے بھڑک سکتے نہیں؟
کیا ترا وہ گلخنِ پر سوز اب گُل پوش ہے

کیا ابھی باقی ہے تیری روح میں اگلی تڑپ؟
آ میں دیکھوں اب بھی کیا سینے میں تیرے جوش ہے

حشر ہے عالم میں برپا اور تو ہے مطمئن
شور ہے محفل میں پیدا اور تو خاموش ہے

جاگ اٹھی قوم تیرے نغمۂ بیدار سے
پہلے وہ بیہوش تھی اور آج تو بیہوش ہے

"کُند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا"
"جاگ اُٹھ غفلت سے وقتِ خود فراموشی گیا"

سرسیدؒ کے مزار پر

چراغِ علم روشن ہے حقیقت کی ہواؤں میں
حکومت کر رہا ہے ایک گوشے سے فضاؤں پر

یہ سرسبزی و شادابی جو ویرانی کا حاصل ہے
رگوں میں اسکی پوشیدہ تموّج خیز اک دل ہے

ابھی تک خاک میں اسکی ہے جوشِ ارتقا باقی
لحد پر گھاس کے پتوں میں ہے نشو و نما باقی

ابھی تک انجمن میں گونج باقی ہے صداؤں کی
ابھی تک کھیلتی ہے خاک سے شوخی ہواؤں کی

یہ بزمِ "خوابِ سرسیدؒ" یہ نقشِ عظمتِ رفتہ
مئے ایثار سے لبریز ہے اک جامِ نورانی

محبت کی طرح آباد رکھے گا خدا اس کو
مٹا سکتی نہیں دنیا کے حادث کی ہوا اس کو

میں ذوقِ علم لے کر تربتِ سیّد پر آیا ہوں
عقیدت کے شگفتہ پھول اپنے ساتھ لایا ہوں

مری وحشت لئے پھرتی ہے گرمِ جستجو مجھ کو
سکوں اندوز ہونے کی بہت ہے آرزو مجھ کو

فضاؤں میں محبت کی حقیقت آشنا ہوں میں
اک آغوشِ ادب میں پرورش پاتا رہا ہوں میں

بقدرِ ذوق تکمیلِ تمنا کی تمنا ہے
اسی آغوش میں معراجِ فردا کی تمنا ہے

تمنا ہے جہانِ علم میں چمکوں سُہا بن کر
جمودِ ظلمتِ ہستی پہ چھا جاؤں ضیا بن کر

تمنا ہے کہ دنیا مجھ سے یکسر نور ہو جائے
یہ تاریکی سمٹ کر ایک دن کافور ہو جائے

تمنا ہے کہ سرسید نہوں یا شبلی و حالی
کہ ان اربابِ محفل کی ابھی تک ہے جگہ خالی

الٰہی خاکِ سرسید سے کچھ چنگاریاں دیدے
مذاقِ دل ترستا ہے تپش سامانیاں دیدے

مری قسمت میں اس میخانے کا ساغر نہیں یا رب
عوض میں اس کے مجھ کو مشربِ پیر مغاں دیدے

جہاں اک طائرِ سدرہ کسی دن چہچہایا تھا
انہیں شاخوں پہ مجھ کو افتخارِ آشیاں دیدے

جو میرے سازِ فطرت میں نیا اک سوز بھرنا ہے
تو جوہر اور ظفر کی سی زبانِ نغمہ خواں دیدے

مجھے درکار ہے پھر ملک و ملت کی حدی خوانی
نذیر و شبلی و حالی کا اندازِ بیاں دیدے

غبارِ رہگذارِ دہر میں آلودگی کب تک؟
مرے ذرّیں تصوّر کو بساطِ کہکشاں دیدے

دماغ و ذہن میں اک جنگ برپا ہے خیالوں کی
اسے ہموار کر کے ایک سکونِ جاوداں دیدے

اگر ہے قافلے کے ساتھ چلنا میرا ناممکن
تو مجھ کو رہنما کر دے مجھے اک کارواں دیدے

زمیں پر پاؤں پھیلانے کی گنجائش اگر کم ہے
مجھے بادل بنا دے سیر کو اک آسماں دیدے

اگر تخئیلِ سرسید ہے اب گلدستۂ ماضی
جوانی کی امنگوں کو نئی انگڑائیاں دیدے

پیامِ کامیابی دے مجھے ایوانِ رفعت سے
میں خالی ہاتھ جا سکتا نہیں سید کی تربت سے

مرزا غالبؔ

راز دانِ زندگی اے ترجمانِ زندگی ہے ترا ہر لفظ زندہ داستانِ زندگی
ہر تبسّم سے ترے پیدا فغانِ زندگی ہر فغاں تیری نشیدِ گلستانِ زندگی

گلشنِ حسن و وفا کی آبیاری تجھ سے ہے
خاک کے ذرّوں کو فخرِ تاجداری تجھ سے ہے

دورِ مستقبل پہ دُنیا کی نگاہیں تھیں تری رہبرِ راہِ عمل دلدوز آہیں تھیں تری
سینۂ علمِ حقیقت میں پناہیں تھیں تری عرش سے بھی اور آگے جلوہ گاہیں تھیں تری

کام تھا تجھ کو نہ مطلق ہستیٔ ناکام سے
تھی نوا وابستہ تیری پردۂ الہام سے

فلسفے کی خوبصورت ترجمانی تونے کی دشتِ ہُو، میں آنسوؤں سے باغبانی تونے کی
اپنی آنکھوں سے مسلسل خونفشانی تونے کی مدتوں ملکِ سخن پر حکمرانی تونے کی

روحِ مطلق جذب تھی گویا ترے احساس میں
قدس کے نغمے نہاں تھے پردۂ انفاس میں

نطق کو تو نے دیا پیرایۂ سوز و گداز — خون سے کر کے وضو تو نے پڑھی اکثر نماز
گونج اُٹھا تیرے نغموں سے حریم حسنِ ناز — آج تک محفوظ ہے ہر دل میں تیرا سوز و ساز

عالمِ بالا سے اک پیغامِ نَو لاتا تھا تو
روح کی گہرائیوں تک اُس کو پہونچاتا تھا تو

میکدہ تھا تیرا یکسر سوز مطلق ساز بھی — تھی مئے ہندی بھی ساغر میں مئے شیراز بھی
تو حقیقت فہم بھی تھا آشنائے راز بھی — روح کی آواز تھی گویا تری آواز بھی

"نقشِ فریادی ہے تیری شوخیٔ تحریر کا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

آہ خاکِ ہند میں تو دیر سے خوابیدہ ہے — زینتِ ہر بزم تیرا جلوۂ نادیدہ ہے
تیرے غم میں آج بھی جانِ سخن کاہیدہ ہے — ہے تصرف تیرا پیدا اور تو پوشیدہ ہے

سوز تیرا آگ بن کر بزم پر چھا جائے گا
سازِ ہستی حشر تک تیرے ہی نغمے گائے گا

انتباہ!

سنہ ۱۹۳۶ء

(ایک طائرک کو اپنے آشیاں سے پہلی مرتبہ مائلِ پرواز دیکھ کر)

کہاں جاتا ہے اس شورش کدے میں ٹھوکریں کھانے
یہاں تو ہر قدم لغزش ہے اے ناداں دیوانے

یہ دنیا جس کو تو نے خواب کی تعبیر سمجھا ہے
نہیں آغوشِ مادر بلکہ اس کا نام "دنیا" ہے

یہ دنیا ہر ہوا کی موج سے طوفاں اٹھاتی ہے
پرِ پرواز دے کر دام میں اپنے پھنساتی ہے

مجھے معلوم ہے اس قید سے گھبرا رہا ہے تو
فضا کو دیکھتا ہے اور کھویا جا رہا ہے تو

مجھے معلوم ہے اڑنے کو للچاتا ہے دل تیرا
ہواؤں کے جھکولوں سے اڑا جاتا ہے دل تیرا

تری نظروں میں اک شاداب سی وسعت ہے دنیا کی
یہ سرسبزی چمن کی اور لہریں موجِ دریا کی

پہاڑوں کی سنہری چوٹیاں ہیں تیری نظروں میں
یہ لہراتی ہوئی ندیاں مچلتی ہیں نگاہوں میں

تجھے دیتے ہیں دعوت چہچہے رنگیں فضاؤں کے
بلاتے ہیں تجھے اپنی طرف دامن گھٹاؤں کے

مگر ناداں سن مجھ سے کہ یہ سب ہے نظر بندی
حقیقت میں یہاں پرواز کے معنی ہیں پربندی

مرے ننھے سے طائر بیٹھ اپنے آشیانے میں
ترے ہم جنس سرگرداں ہیں لاکھوں اس زمانے میں

یہ دُنیا خود غرض خودکام ہی اور خود نما بھی ہے
فریبی لالچی مکار پاپی بے وفا بھی ہے

شناور بحرِ ہستی کا ہوں طوفاں آشنا ہوں میں
جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہی تجھ سی کہہ رہا ہوں میں

یہاں موجوں کی پہنائی میں چھپکر سانپ رہتے ہیں
یہاں پھولوں کی رگ رگ میں ہزاروں خار رہتے ہیں

یہاں سب سے الگ رہنا ہی اصل شادمانی ہے
یہاں گوشہ نشینی ہی حقیقی حکمرانی ہے

یہاں اک اور خطرہ ہے جسے "انساں" کہتے ہیں
یہ انساں رات دن غارت گری میں محو رہتے ہیں

یہ چھپ چھپ کر تمدن کے لباسِ خود نمائی میں
بظاہر اشرف المخلوقات بنتے ہیں خدائی میں

مگر ان کے دلیرے کچھ درندوں سی بھی بدتر ہیں
یہ مردے چیرنے والے پرندوں سے بھی بدتر ہیں

یہ تجھ کو اپنے دامِ رنگیں میں پھنسائیں گے
یہ اپنی رہزنی سے تیری آزادی چرائیں گے

زباں پر ان کی مرہم اور نظریں انکی نشتر ہیں
دکھانے کے لئے شہد و شکر باطن میں خنجر ہیں

تو پہلے آشیاں میں اپنی قوت منضبط کر لے
پرِ پرواز میں غم جھیلنے کی ہمتیں بھر لے

تو پہلے واقفِ رازِ فضائے گلستاں ہو جا
پھر اپنے آشیاں سے جس طرف چاہے رواں ہو جا

ابھی معصوم ہے نا فہم ہے نا آشنا ہے تو
کہاں اس خود غرض سنسار میں لٹنے چلا ہے تو

ہوائیں ناموافق چل رہی ہیں اس زمانے میں
سمیٹ اپنے پروں کو بیٹھ اپنے آشیانے میں

تمدّن

ہوئی تخیلِ انساں باعثِ بربادیِ انساں
لٹادی فکرِ آزادی نے خود آزادیِ انساں

یہ فطرت کی تمنا میں ہوا پابند پستی کا
زمیں کی گود میں چمکا ستارا اس کی ہستی کا

یہ تھا اک جزوِ فطرت فطرتاً تخلیق میں اپنی
مگر پھر بھی بھٹک کر رہ گیا تحقیق میں اپنی

بنائی اپنی دنیا اس نے فطرت سے الگ ہو کر
مکدر ہو گیا فطری لطافت سے الگ ہو کر

کیا محدود آخر دائرہ اپنے تخیّل کا
بنا دامِ گلستاں اک نیا پھندا رگِ گل کا

اسی ذہن میں بنالیں اس نے کچھ خوش رنگ زنجیریں
خیال و ذہن کو پابند کر لینے کی تدبیریں

تمدن بھی اسی کے ذہن کی ہے اک انگڑائی
سکوں کی جستجو شورش کدے سر پر اٹھا لائی

یہ حکمت، یہ سیاست اور یہ تہذیبِ انسانی
یہ عمرانی و قانونی نمائش کی فراوانی

یہ قومی اصطلاحیں قومیت کے مقفل آئیں
یہ رنگا رنگ شعبے اور یہ آدابِ پُر تمکیں

یہ سب کیا ہیں فقط ہذیانِ ذہنِ آدمیت کے
فنا ان سے ہوئے معصوم جلوے بزمِ فطرت کے

تمدن کیا ہے؟ ذہنیت کی اک کمزور حد بندی
ڈبو دے گا کبھی انساں کو طوفانِ خرد مندی

جبر و قدر

پھول سرمست تھا گلشن میں بہاروں کی طرح
مستیاں جھومتی تھیں بادہ گساروں کی طرح

کہکشاں کہتی تھی رومانیت افزا ہوں میں
چاند کہتا تھا کہ آئینہ فزا ہوں میں

قولِ خورشید تھا مجھ سے ہے یہ دنیا قائم
تارے کہتے تھے کہ ہم سے ہے ثریا قائم

آبشاروں میں تموج کی نمو تھا یہ خیال
لالہ زاروں میں تھی رنگینی و بو اس کا مآل

الغرض دہر میں جس سمت بھی جاتا تھا میں
بزمِ فطرت کو اسی وہم میں پاتا تھا میں

ان خیالوں پہ کیا غور جو گہرا میں نے
رازِ تخلیق بڑی دیر میں سمجھا میں نے

اختیار ان کو خدائی پہ ملا کوئی نہیں،
ناخدا ہیں مگر ان میں خدا کوئی نہیں

جبر ہے ان کے لئے طاعتِ فطرت گویا
خامشی ان کی ہے "خاموش شکایت" گویا

پھول قادر ہے نہ کھلنے پہ نہ مرجھانے پر
مستیاں خود بھی ہیں مجبور اتر جانے پر

کہکشاں دن کو نمودار نہیں ہو سکتی
چاند کی صبح ہم انوار نہیں ہو سکتی

ایک لمحہ نہیں خورشید کو آرام و قیام
چشمِ انجم کے لئے خواب ہے تا صبح حرام

آبشار ایک گھڑی چپ رہے یہ ناممکن ہے
لالہ زار اپنی خزاں روک دیں ناممکن ہے

اے ضیا ہے یہی دنیا میں ہر انسان کا حال
اس کی قدرت میں نہیں اپنا کمال اور زوال

زندگی، موت، عنا اور غنا بس میں نہیں
نہیں قبضے میں فنا اس کے بقا بس میں نہیں

ہے مساوی روشِ عالمِ ایجاد یہاں
کون قانونِ فطرت سے ہے آزاد یہاں

پھر یہ فریاد، یہ تکرار یہ حجت کیسی؟
جبر بنیادِ جہاں ہے تو شکایت کیسی؟

بیداری

(ٹیگور)

جہاں بے خوف ہو دل سر میں سودائے محبت ہو
جہاں آزاد ہو تعلیم اور احساسِ رفعت ہو

جہاں بد رسمی ناقص کی دیواریں نہ ہوں حائل
جہاں الفاظ اور اعلان میں گہری صداقت ہو

جہاں آسان ہر امکان ہو تکمیلِ ہستی کا
جہاں باطل نہ ہو مطلق حقیقت ہی حقیقت ہو

جہاں سست خیالوں میں عصمت ہو جالوں میں
جہاں پیشِ نظر تسکین و آزادی کی جنت ہو

وہیں یا رب مرا پیارا وطن بیدار ہو جائے
مسرت کے حقیقی کیف سے سرشار ہو جائے

کالج کو آخری سلام

اے مریضِ جہل و غفلت کے معالج الوداع
مشرقِ علم و عمل اے میرے کالج الوداع

زندگی آغوش میں تیری کٹی ہے سات سال
فطرتاً تیری جدائی کا مجھے بھی ہے ملال

وہ خرامِ صبح میں نازش ترے ایوان پر
دھوپ میں وہ بیٹھنا تیرے "شگفتہ لان" پر

یاد جب آئے گی تیری محفلِ آسودگی
ذہن پر ہوگی گراں اپنی عدم موجودگی

ہے مگر تیرا یہ اک فطری اصولِ جاوداں
تو یونہی آگے بڑھا دیتا ہے اپنا کارواں

قافلے والوں کو دے کر مژدۂ منزل رسی
تو وہیں رہتا ہے قائم ہی جہاں منزل تری

تو یونہی تاباں رہے اے آفتابِ زندگی
تو نے ذرّوں کو بنایا کامیابِ زندگی

زندگی کی تجھ سے لیکر اک ضیا جاتے ہیں ہم
نام کرنے کیلئے روشن ترا جاتے ہیں ہم

ہفت سالہ زندگی میں تو نے جو کچھ ہے دیا
وہ خزانہ اور سرمایہ ہے علم و فضل کا

اس کو اب دُنیا کے ہر شعبے میں پھیلائیں گے ہم
ملک کی خدمت کرینگے تیرے گُن گائیں گے ہم

یاد تیری تاقیامت دل سے جا سکتی نہیں
زندگی اپنی ترے احسان بُھلا سکتی نہیں

جب تری جانب سے گزریں گے کبھی ہم شادکام
تیری عظمت کو کرینگے دُور سے جھک کر سلام

جانے والے تجھکو دیتے ہیں پیامِ آخری
ہو قبول اے "مادرِ ثانی" سلامِ آخری

بشارت

نشاطِ تازہ ہے دل پہ طاری بساطِ کہنہ تمام ہوگی
نئی نئی میری صبح ہوگی نئی نئی میری شام ہوگی

وہ ظلمتِ شب جو ابر بنکر تمام عالم پہ چھا رہی تھی
چمک کے نجمِ فلک بنے گی نکھر کے ماہِ تمام ہوگی

نسیمِ مشرق جو آ رہی ہے نویدِ نوروز لا رہی ہے
بنے گا ساقی ہر اک گلِ نو کلی کلی ایک جام ہوگی

حدودِ علم و عمل میں تہذیب کے سلیقے کرونگا پیدا
جو بزم پُرشور و منتشر تھی وہ قابلِ انتظام ہوگی

میں ایک منزل کے بعد گزرونگا منزلِ نو کی وسعتوں سے
جو ہے تجلّی گہہِ ثریا وہ میری جائے قیام ہوگی

ہے ضوفشاں صبحِ زندگانی ہے سامنے راہِ کامرانی
حکومتِ بزمِ شادمانی پھر آج سے میرے نام ہوگی

مذاقِ دل میں جو گرمیاں ہیں رہیں گی باقی یونہی مسلسل
رہے گی جزوِ عمل محبت، وفا شعارِ دوام ہوگی

میں سرخروئی کے کیف سے اک شفق بناؤنگا ہنسنے والی
مرے خیالوں کے ساغروں میں نئی مئے لالہ فام ہوگی

ضیائے آفتاب کی ہر کرن یہ مژدہ سنا رہی ہے
کہ آنے والی جو زندگی ہے مسرتوں کا پیام ہوگی

انسانؔ

(۱۹۳۵ء)

خیالاً جنوں جب جھوٹ کھاتے ہیں رگِ جاں سے
تو گھبرا کر الجھتا ہوں میں افکارِ پریشاں سے

نہیں آتیں سمجھ میں یہ عجوبہ کاریاں یارب
خرابِ آباد میں تھی کیا غرض تخلیقِ انساں سے

تری جلوت پسندی کے لئے تارے ہی کیا کم تھے
تری قوت کی تابش کیا نہ تھی مہرِ درخشاں سے

شفق کیا گیت تیری خودنمائی کے نہ گاتی تھی
جھلکتا تھا نہ تو کیا پردہ ہائے صبحِ خنداں سے

زمیں سے کیا نہ ہوتی تھی تری صنعت گری پیدا
تری طلعت نمایاں کیا نہ تھی مہتابِ رخشاں سے

لکھی جاتی نہ تھی کیا برگِ گل پر داستاں تیری
سحر کے وقت جب گرتے تھے موتی انجستاں سے

نکلتی کیا نہ تھی لیلائے شب زلف اپنی بکھرا کر
ردائے ابر دوش، ہیبت آفریں کوہ و بیاباں سے

تو کیا تخلیقِ انساں سے تھا یہ ملحوظِ خاطر میں
کہ ربطِ باہمی ہو جائے فطرت کے مظاہر میں

بنایا تو نے انساں اس کو تاروں کی ضیا دیدی
قمر کا نور دے کر صبحِ صادق کی حیا دیدی

شفق کا رنگ بخشا اور تپش خورشیدِ انور کی
زمیں کا عجز، رفعت عرش کی سر تا بپا دیدی

وقارِ کوہ، چشموں کی روانی، کیف پھولوں کا
نہالِ باغِ ہستی کو گلستاں کی ادا دے دی

شرفِ مخلوقِ عالم کو دیا اجسامِ ہستی پر
ذرا سے آدمی کو کشورِ ارض و سما دے دی

کمال و علم دے کر کر دیا افضل فرشتوں سے
جمال و حسن دے کر طلعتِ ماہِ سُہا دے دی

تجلّیِ حقیقت چشمِ ظاہر سے چھپانی تھی
تو اک روح کو اک مادیت کی ردا دے دی

بنایا خاک سے انساں کو اک پیکرِ رنگیں
اور اس کی خامشی کو سازِ فطرت کی نوا دے دی

نظر میں رفعتیں، انفاس میں تابندگی لے کر
چلا بزمِ ازل سے کاروانِ زندگی لے کر

یہ انساں جو بیک وقت ایک ذرہ ہے اور اک تارا
ہوا کرتا ہے بزمِ ماہ میں جو انجمن آرا

یہ انساں یعنی بزمِ خلد سے پھینکا ہوا جگنو
یہ تاریکی و تابانی کا اک آوارہ سیّارا

یہ انساں جو فلک ہے اپنی فطرت کی بلندی میں
ثریا جس کا جھولا کہکشاں ہے جس کا طیارا

یہ انساں سربلندی جس کی آب و گل میں پلتی ہے
ہے جس کا ذہنِ عالی عظمت و رفعت کا گہوارا

یہ انساں روح کی پرواز جس کو لے اڑی آخر
ستارا بن گئی ہے جس کی تخیلِ سپہر آرا

یہ انساں جس کی ہستی رازہ ہے تخلیقِ عالم کا
یہ انساں جو یہ سرِ اندازہ ہے کونین کا پیارا

یہ انساں جس کی فطرت ہے حقیقت آشنا ہونا
زمیں پر بیٹھ کر جو عرش کا کرتا ہے نظارا

الٰہی اس کو دے کر یہ خودی یہ ارتقا تو نے
مجازی کر دیا ہے دوسرا پیدا خدا تو نے

یہاں آتے ہی دُنیا بھر پہ قبضہ کر لیا اس نے
زمین کوہ و بحر و بر کو اپنا کر لیا اس نے

دیا پیغامِ تسکیں مضطرب امواجِ دریا کو
سکوں بجلی کے شعلوں سے جھپا کر لیا اس نے

حدیثِ راز در سینہ یہ گونجا کوہساروں میں
بدل کر ابر کی شورش کو نغما کر لیا اس نے

ڈھلا قانونِ ہستی اس کی خواہش اور ارادے پر
نظامِ دہر کو پابند ایسا کر لیا اس نے

نہ آیا جب سمجھ میں کون اس دنیا کا خالق ہے
تو خود ہی اک خدا کا نقش پیدا کر لیا اس نے

سُنے اسرارِ فطرت کے سمندر اور پہاڑوں سے
ہر اک ذرّے ہر اک قطرے کو گویا کر لیا اس نے

نگاہوں سے نوا سے عزم سے ہمت سے کوشش سے
جہاں پر حکمرانی کا ارادا کر لیا اس نے

جب اسکو فتح مندی مل گئی دنیائے ظاہر پر
تو مائل ہو گئی تخیّل باطن کے مناظر پر

کیا نظارہ جب دل کا تو اس میں اک جہاں دیکھا
ذرا سے ذرّے کو صورت نمائے آسماں دیکھا

اُٹھیں نظریں تو دنیا بھر کو پایا مظہرِ فطرت
جھکایا سر تو دل کو مخزنِ رازِ نہاں دیکھا

یہی چھوٹا سا دل گل ریز بھی تھا خار انگن بھی
اسی میں سیرِ صحرا کی اسی میں گلستاں دیکھا

اسی کو جذبۂ عیش و طرب سے پُر سکوں پایا
اسی کو شورشِ اندوہ و غم سے نوحہ خواں دیکھا

نظر تو رہ گئی ٹکرا کے پھولوں اور تاروں تک
مگر اس دل نے بامِ عرش دیکھا لامکاں دیکھا

کئے ویرانۂ ہستی سے پیدا لاکھ ہنگامے
جہاں کچھ بھی نہ تھا اس نے وہاں سب کچھ عیاں دیکھا

جہاں تاریکیوں کو ہیبتِ باطل سے لرزش تھی　　تجلّی حقیقت کو وہاں بھی ضوفشاں دیکھا

الٰہی دل دیا یا معرفت کا آئینہ تو نے
ذراسی چیز میں رازِ دو عالم بھر دیا تو نے

کبھی انسان نے اقصائے عالم پر خدائی کی　　کبھی بنکر پیمبر کارواں کی رہنمائی کی
کبھی نخوت کبھی نکبت کبھی عشرت کبھی عسرت　　کبھی یاس اور کبھی امید سے جنگ آزمائی کی
کہیں کھا اساسِ پیر پوجا سنگ و آتش کو　　کہیں کعبہ بنا کر طرح ڈالی پارسائی کی
کبھی ایوان میں جا بیٹھا کبھی دامانِ صحرا پہ　　کبھی مشقِ گدائی کی کبھی فرمانروائی کی
کہیں عشق و جنوں کے جوش سے دیوانہ بن بیٹھا　　کہیں نغمۂ نوائے حسن بن کر دلربائی کی
کبھی آرائشِ محفل کبھی ہنگامۂ میداں　　کبھی بیگانگی پیشہ کبھی دھن آشنائی کی
کبھی شاداں کبھی گریاں کبھی نادم کبھی نازاں　　غرض ہر رنگ میں ہر روپ میں جلوہ نمائی کی

میسّر کیفِ باطن تھا اسے تسکینِ ظاہر بھی
مگر اک تشنگی سی روح میں باقی رہی پھر بھی

یہ انسان فعتاً جب گھر گیا وسواسِ باطل میں　　ہوئی برپا نئی اک جنگ اسکی عقل اور دل میں
تقاضا دل کا تھا عیش و ہوس میں زندگی گذرے　　پیامِ عقل تھا ہو حکمراں دنیا کی محفل میں
خودی خود رو ہی نے ذہن و دل پر جب کیا حملہ　　ہوئی تحریک پیدا فطرتِ خاموش و کامل میں

مسلط ذہن پر بارِ سیاست کر لیا اس نے
پھنسایا دل کو پھر مذہب کے پیچیدہ مسائل میں

قوانینِ سیاست نے کیا مغلوب ذہنوں کو
امید و بیم کی شورش نے قائم کیں خلشیں دل میں

سیاست نے اُدھر کمزور قوموں کو کچل ڈالا
قناعت کی اِدھر تعلیم دی مذہب نے مشکل میں

غرض انساں کو تسکیں کسی صورت نہیں حاصل
بھٹکتا پھر رہا ہے مدتوں سے راہِ منزل میں

یہ جب فطرت سے اپنے ذہن اور دل کو لگائے گا
تو اس ہنگامۂ پُرشور میں تسکین پائے گا

الٰہی خاطرِ انساں کو سوز و سازِ فطرت دے
ہٹا کر اس کا دل باطل سے احساسِ حقیقت دے

یہ انساں ذہن ہے اُلجھا ہوا جسکا سیاست میں
اسے شورش گہِ عالم میں تسکینِ محبت دے

یہ انساں جو سمجھتا ہی نہیں مفہوم مذہب کا
لگا کر اسکے دل میں اپنی لو شمعِ ہدایت دے

یہ انساں فکر جسکی محو ہے سرمایہ داری میں
اسے اپنے ہی ہم جنسوں سے ہمدردی کی ہمت دے

یہ انساں جنگ اور شورش میں جسکا دل بہلتا ہے
اسے تسکیں کا پیغام بن جانے کی قوت دے

یہ انساں جو ہر انسانیت کو بھول بیٹھا ہے
اسے انساں بنا اس کو وقارِ آدمیت دے

تری دُنیا میں اس انسان سے گھبرا گیا ہوں میں
مجھے اک انقلابِ حشر ساماں کی اجازت دے

زبسکہ مائلِ تخریب ہے یہ نسلِ انسانی
ضروری ہو گیا ہے انقلابِ عالمِ فانی

توازن کس طرح پیدا ہو شورش گاہِ ہستی میں
کہ دنیا اپنی مستی میں ہے انساں اپنی مستی میں

یہاں انسانیت معدوم ہے انسان ناپیدا
غرض کی کارفرمائی ہے خودغرضوں کی بستی میں

کہاں روح کی عظمت کہاں یہ مادّی ساماں
کوئی نسبت بھی ہو آخر بلندی اور پستی میں

تو اے انساں غلط رستے میں ہے گم کردہ منزل
کبھی دنیا پرستی میں کبھی مذہب پرستی میں

تری تخلیق کا مقصد نہیں ہے مٹ کے رہ جانا
بقا کی سوچ تدبیریں فنا کی چیرہ دستی میں

اگر خود ہی پرستش ہے تو اپنی ہی پرستش کر
نہ مر زندہ پرستی پر نہ کھو مردہ پرستی میں

تری دنیا میں پھر اک دور ایسا آنے والا ہے
نظر آئیگا ہر انسان کامل بزمِ ہستی میں

یہ دنیا اے ضیا کس رشکِ فردوسِ نظر ہو گی
جب انساں بن کے خود فطرت جہاں میں جلوہ گر ہو گی

کیوں دوسروں پہ تم وہ اصلاح کرے
پہلے انسان اپنی اصلاح کرے
طوفانِ حوادث یہ نہ جھیلنے پڑیں
اپنی ہستی درست فلاح کرے

رخصت اے میرے وطن!

چھوڑ کر پھر تجھ کو اے پیارے وطن جاتا ہوں میں
دل میں اک ہنگامۂ رنج و الم پاتا ہوں میں

اُف تری دامن کشی اٹھتا ہے رُک رُک کر قدم
دور تک جاتا ہوں میں پھر لوٹ کر آتا ہوں میں

کوندتی ہیں بجلیاں میرے دلِ غمناک میں
گیت تیرے ہجر کے جب اے وطن گاتا ہوں میں

وہ ترے سادہ مناظر، وہ نظر کش وادیاں
آہ وہ دریا وہ نہریں، سبزہ زار و گلستاں

ہو گیا دردآشنا میں تجھ میں رہ کر اے وطن
تیری خلوت میں ہوا حُسن و محبت کا وصال

عیشِ مستقبل کی بنیادیں یہاں رکھی گئیں
کر دیا تقدیر نے وابستۂ کیفِ مآل

اے وطن تیرا ہر اک ذرہ ہو رشکِ بامِ طور
حشر تک آئے نہ تیری دلفریبی میں زوال

تجھ سے رخصت ہو کے اب میں جا رہا ہوں خستہ جاں
دیکھیے اب کب دکھائے تیری صورت آسماں

مجھ کو تڑپائیں گے غربت میں وہ نظارے ترے
کوہ کے دامن میں وہ حسنِ غروبِ آفتاب

مست ہو کر لالہ زاروں میں وہ میرا گھومنا
چلّوؤں سے اپنے پینا بھر کے صہبائے چناب

ساحلِ دریا پہ وقتِ شام وہ جانا مرا
موجزن امواج میں وہ جلوہ حسن و شباب

لے گجر بجنے لگا چھٹتی ہے تیری انجمن
رخصت اے میرے وطن، اچھے وطن پیارے وطن!

جامِ صحت

مبارک شاعرِ اعظم[۱] حیاتِ جاوداں تجھ کو
نئے سر سے ملی ہے پھر بقائے جسم و جاں تجھ کو

ادب کی منزلوں میں ہے ثباتِ کارواں تجھ سے
سمجھتا ہے زمانہ قائدِ ہندوستاں تجھ کو

مرے ٹوٹے ہوئے دل کی دعائیں ساتھ تھیں تیرے
بھلا پھر گردشیں کس طرح کرتیں رائیگاں تجھ کو

ترے دریا میں حاصل ہے مجھ کو بھی درخشانی
خدا تا دیر رکھے تابش افزائے جہاں تجھ کو

چنی ہیں میں نے کچھ چنگاریاں تیرے ہی خرمن سے
شرار و برق سے محفوظ رکھے آسماں تجھ کو

ترے ہاتھوں سے ہونی ہے مری تعمیرِ مستقبل
خدا رکھے مری دنیائے حسرت میں جواں تجھ کو

برائے نذر لے آیا ہوں چند آنسو عقیدت کے
انھیں آنسو نہ باور کر یہ دریا ہیں مسرت کے

[۱] حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی مدظلہ،

میری دُنیا

دھندلے سے کچھ خیال، پریشاں سے کچھ نقوش
ہر وقت جلوہ ریز ہیں میرے دماغ میں

انگڑائی لے رہی ہے بہارِ تصوّرات
جیسے رواں شمیم کی موجیں ہوں باغ میں

یوں دل شکستہ ہوں پرِ پروانہ جس طرح
ٹوٹا ہوا پڑا ہو فسردہ چراغ میں

کیفیتیں ہیں میری طبیعت کی مختلف
صد رنگ اک شراب ہے میرے ایاغ میں

سینے کے داغ داغ میں منظر ہے طور کا
گویا کہ تابشِ یدِ بیضا ہے داغ میں

اک نغمہ آشنا ہے نیا میرے کان سے
جو سُن رہا ہوں کہہ نہیں سکتا زبان سے

منزل ہے میری مادّیت سی بہت بعید
ہر وقت قصرِ روح میں میرا گذار ہے

دنیا مری نظر میں ہے اک وادیِ سراب
انساں مری نگاہ میں بے اعتبار ہے

روحانیت سے سرحدِ دل ہے ملی ہوئی
اس آئینے سے عرشِ خدا آشکار ہے

دو راستے ہیں سامنے میرے کھلے ہوئے
اک بے حجاب ایک اسیرِ غبار ہے

اک کہر سا محیط ہے ماحولِ فکر پہ
اک ابرِ زندگی پہ مری کیف بار ہے

لرزاں ہے بے خودیٔ نظر عرش بوس میں
بھیگا ہوا پڑا ہوں خیالوں کی اوس میں

اسرار سے ہے بزمِ تصوّر سجی ہوئی
ذہن رسا میں آمد و رفتِ خیال ہے

گھبرا رہا ہوں جوشِ تخیّل کی آگ سے
میرے لئے سکونِ طبیعت محال ہے

پیدا ہے ہر خیال کے بعد اک نیا خیال
دُنیا مری اسیرِ فریبِ مآل ہے

تکمیل مجھ سے پا نہیں سکتا کوئی نظام
یعنی عمل سے دُور مری قیل و قال ہے

یارب اس انتشار کو شیرازہ بند کر
اس کشمکش میں واقعی جینا محال ہے

کر جذب میری روح میں رنگِ کمال کو
دے قوّتِ عمل بھی نشاطِ خیال کو

آوارہ حسین ہیں صورتیں بیٹھی ہوئی ہیں
ہاتھ ہوں آتی مصروفِ تکلّف بیٹھی ہیں

تحقیق کی رو سے جنس لئے پھرتا ہوں
ویرانۂ تخیلات کا اسمیں بیٹھی ہیں

مجھے خاموش رہنے دو!

یہ چڑیاں چہچہاتی ہیں تو ان کو چہچہانے دو
پرندوں کو درختوں پر خوشی کے گیت گانے دو
زمیں پر ابر کی ہر بوند کو نغمے سنانے دو
فلک پر لیلئ قوسِ قزح کو مسکرانے دو
مرا دل سرد ہے، مجھ کو یونہی بیہوش رہنے دو
مجھے خاموش رہنے دو!

فضائے دہر لبریز مسرت ہے تو مجھ کو کیا
اگر دنیا خرابِ عیش و عشرت ہے تو مجھ کو کیا
جو معمورِ صدا سازِ محبت ہے تو مجھ کو کیا
جہاں کو میرے نغموں کی ضرورت ہے تو مجھ کو کیا
مجھے اپنے خیالوں ہی سے ہم آغوش رہنے دو
مجھے خاموش رہنے دو!

مجھے فرصت نہیں ہے فرطِ غم سے سر اٹھانے کی
گراں ہے میرے دل پر شورش و کاوش زمانے کی
ابھی کڑیاں مرتب ہو رہی ہیں اک فسانے کی
ابھی ساعت کہاں ہے داستانِ دل سنانے کی
کسی کی یاد میں مجھ کو تصور کوش رہنے دو
مجھے خاموش رہنے دو!

جو میں بولا تو سب کو اپنے اشکوں میں بھگو دونگا
دلِ انساں میں غم کے سینکڑوں کانٹے چبھو دونگا

جو میں بولا تو گویائی زمانے بھر کی کھو دونگا
جو میں بولا تو دنیا کو خموشی میں ڈبو دوں گا

یہی بہتر ہے خلوت میں مجھے خاموش رہنے دو!
مجھے خاموش رہنے دو!

سراب

غلط یہ کاہشِ الم، یہ شکوہ کاریاں غلط
وفورِ درد سے یہ تیری بے قراریاں غلط

طلب کا ذوق اگر نہیں تو پا فگاریاں غلط
مذاقِ گریہ گر نہیں تو شعلہ باریاں غلط

زمیں پہ دھوپ دیکھ کر یہ توبہ خوانیاں گناہ
فلک پہ ابر دیکھ کر یہ بادہ خواریاں غلط

کنارِ بحر میں یہ اضطرابِ موج بے محل
نسیم کی حریمِ گل میں مست کاریاں غلط

یہ جذبہ ہائے حسن و عشق بے ثبات و رائیگاں
جفا طرازیاں غلط وفا شعاریاں غلط

ہے شورشِ بہار میں تمیزِ خار و گل فضول
ہے بیخودی ہی بے خودی تو وضعداریاں غلط

یہ گلستاں میں لالہ و سمن کا جوش ناروا
یہ آسماں پہ بجلیوں کی جلوہ داریاں غلط

سمجھ رہا ہے تو یہ رنگ باعثِ شکیب ہے
غلط غلط، نہیں نہیں سراب ہے فریب ہے

احساسات

تری بہائیں پھر گر میاں بڑھا رہا ہوں میں
یہ کیا کہا کہ غلامی کو بھول جاؤں میں؟

غلام ہوں مجھے احساس ہے غلامی کا
جو مجھ سے پوچھے تو کچھ صاف صاف کہہ سناؤں میں

نہ چھیڑ مجھ کو کہ ہوں پائمالِ کثرتِ غم
میں رو رہا ہوں تجھے کس طرح ہنساؤں میں

تری مسرتِ باطل کو دعوتِ غم دوں
یہ چاہتا ہوں کہ رو رو کر تجھے رلاؤں میں

جو دے تو مجھ کو اجازت تو لاؤں ویرانی
اور اُس سے تیرا مسرت کدہ سجاؤں میں

مری نظر میں ہے اک دورِ کامراں میرا
تو چاہتا ہے کہ اُس کو بھی بھول جاؤں میں

ترے دیار میں ہے بند راہِ آزادی
ترے دیار میں آؤں تو کیونکر آؤں میں

دیے جلا کے مرا غم جگا دیا تو نے
بتا بتا اسے کس طرح اب سلاؤں میں

یہ حکم ہے کہ چراغاں ضرور ہو شب کو
جو گھر میں تیل نہ ہو تو اُدھار لاؤں میں

مرا یہ حال کہ خود نوحۂ مصیبت ہوں
تجھے یہ ضد کہ مسرت کے گیت گاؤں میں!

تاجر اور شاعر

تاجر:-

میں سونے کی اینٹیں چُن کر، ایوانِ قصر سجاتا ہوں
آرام سے شب بھر سوتا ہوں، اور دن بھر خوب کماتا ہوں

سرمایہ میری دنیا ہے اور دولت میری عقبیٰ ہے
میں گنگا جمنی سائے میں، اپنی تقدیر جگاتا ہوں

مٹی سے پیدا کرتا ہوں اکسیر، یہ ہے تدبیر مری
سائنس بھی حیراں ہوتی ہے جب ایک کے چار بناتا ہوں

اے شاعر میری فطرت سے کیا نسبت تیری فطرت کو
تو دیپک ہے میں بلبل ہوں تو روتا ہے میں گاتا ہوں

تو اک تنہا کاشانے میں مصروفِ کاوش رہتا ہے
میں اپنی عشرت خانے میں چاندی کے ڈھیر لگاتا ہوں

تو بے قدری کے ہاتھوں سے ناکام ہے بزمِ عالم میں
ہے ساکھ مری بازاروں میں، دولت والا کہلاتا ہوں

تو پڑھ کر چند کتابیں اُن سے اپنا دل بہلاتا ہے
میں گاہک کی نظریں پڑھ کر، گاہک کا دل بنجاتا ہوں

میں مرتا ہوں جینے کے لئے، مرنے کے لئے تو جیتا ہے
تو خونِ جگر پیتا ہے اور میں تر لقمے کھاتا ہوں

لفظوں کے گورکھ دھندے میں اُلجھاتا ہے تو ذہن اپنا
میں دھندے کی دانائی سے دل کے پھندے سلجھاتا ہوں

تو ہر سو پھرتا رہتا ہے تخئیل میں اپنی سرگشتہ
میں بیٹھ کر اپنی مسند پر، رہگیروں کو پھسلاتا ہوں

بیکار یہ مسلک چھوڑ اپنا تاجر بن اور تجارت کر
سودائے سخن سے باز آجا میں پھر تجھ کو سمجھاتا ہوں

شاعر:-

اے تاجر! میں بکواس تری سنتا ہوں اور شرماتا ہوں — جب روحِ حقیقت سے خالی تیری باتوں کو پاتا ہوں

تو اپنی دنیا سمجھا ہے چاندی کے فانی ٹکڑوں کو — وہ چیز ہی تیرا سرمایہ، جس چیز کو میں ٹھکراتا ہوں

ہاں سچ کہتا ہے تو، مجھ سے تجھ سے کوئی نسبت ہی نہیں — تو کھیل رہا ہے مٹی سے، میں نور میں کھویا جاتا ہوں

تیری نیّت میں صنعت ہے، میرے لفظوں میں معنیٰ ہیں — تو گاہک کو پھسلاتا ہے میں عالم کو لرزاتا ہوں

تو پیٹ کی دوزخ کے شعلے اپنی لئے بھڑکاتا ہے — میں چھیڑ کے سازِ دل اپنا، فردوس کے نغمے گاتا ہوں

تو مادیت کا سودائی میں روح کے پھولوں کی نکہت — ہے تیری رسائی دنیا تک میں عرش تک آتا جاتا ہوں

تو اپنے مشاغل سے تھک کر، جب غفلت میں سو جاتا ہے — میں جاگ کے چاند اور تاروں میں جلووں سے دل گرماتا ہوں

تو شورش گاہِ ہستی میں بھڑکا دیتا ہے شورش کو — میں اپنے شیریں نغموں سے شورش کی آگ بجھاتا ہوں

تو اپنے جھوٹے فقروں سے گمراہ جہاں کو کرتا ہے — میں قافلۂ آوارہ کو سیدھے رستے پر لاتا ہوں

گُن جمع ہی تیری ہستی کا، میں جوہر روح کی مستی کا — تو گھٹتا ہے میں بڑھتا ہوں، تو کھوتا ہے میں پاتا ہوں

جھنکار زر و گوہر کی تجھے، معذورِ سماعت رکھتی ہے — جس وقت حریمِ فطرت سے پیغام میں لے کر آتا ہوں

محسوس نہیں ہوتی تجھ کو بوچھار بھی میرے مقصد کی — معراجِ تخیّل سے جب میں الہام کا مینھ برساتا ہوں

تو قصر بنا کر سونے کے، گمنامی میں مر جاتا ہے — میں شہرت کے میناروں پر، مر کر بھی شعر سناتا ہوں

پیغامبرِ فطرت ہوں میں، روحانی ہے تعلیم مری — تو کیا مجھکو سمجھاتا ہے، میں دنیا کو سمجھاتا ہوں

میں اس دُنیا کا باطن ہوں، تو اس دُنیا کا ظاہر ہے
میرا تیرا سودا ہی کیا، میں شاعر ہوں تو تاجر ہے

خلش

حُسن کے ساز کی مضرابِ تمنّا کو تلاش
موجِ پُر شور کو ہے ساحلِ دریا کی تلاش

نگہتِ گُل کی یہ حسرت ہے کہ گُل بن جائے
جزوِ ہستی کا تقاضا ہے کہ کُل بن جائے

آسماں چاہتا ہے فرشِ زمیں سے قربت
فکر تارے کو کہ ہو ماہِ حسیں سے قربت

چاند کہتا ہے کہ موجوں میں نہاں ہو جاؤں
موج کہتی ہے کہ میں بحرِ رواں ہو جاؤں

بے خودی کو ہے ضرورت کہ خدا مل جائے
خبطِ پروانہ، حقیقت کی ضیا مل جائے

خواہشِ کرمکِ بے تاب کہ تارا ہو جائے
ہوسِ ذرّہ کہ خود انجمن آرا ہو جائے

اور جنوں مجھ کو کہ ہستی کا نشاں پاؤں میں
ناخدا کشتیٔ ادراک کا ہو جاؤں میں

الغرض شوق کی اک آگ ہے دستورِ حیات
ہے یہی ذوق و تپش شیوۂ دستورِ حیات

فرضِ فطرت ہے یہی ایک فسانہ کہنا
رازِ تخلیق ہے محرومِ تمنّا رہنا

بارِ خاطر

یہ سرکہ بہ جبیں کون آرہا ہے نوجوانوں میں — پڑی ہیں جھریاں رُخسار پر اور جھول کانوں میں
ہنسی لب پر نہ آنکھوں میں محبت آشنا آنسو — بُری چیتون خفا نظریں چڑھی آنکھیں کھچے تیور
خدا جانے خدا نے کس طرح اس کو بنایا تھا — فرشتوں کی سمجھ میں کیونکر اس کا ڈھانچ آیا تھا
یہ حیواں ہے پکڑ کر اس کو حیوانوں میں لے جاؤ — یہ دریا خشک ہے اس کو بیابانوں میں لے جاؤ
یہ بوجھل ہے بہت سوسائٹی پر بار ہے اسکا — یہاں منحوس پن ناقابلِ انکار ہے اس کا
ظرافت کی فضا کو جنگ کا میداں سمجھتا ہے — لطیفہ بھی یہ کہتا ہے تو سُن کر جی اُلجھتا ہے
یہاں جو زندہ دل ہیں اُنکی راتیں اُنکی محفل ہے — یہاں روتی ہوئی صورت کا استقبال مشکل ہے

توازن کی ضرورت ہے بہارستانِ عالم کو — یہاں پھولوں میں بن کر پھول رہنا چاہیئے ہم کو
کہیں ظلمت کے قابل صبح کے انوار ہوتے ہیں — چٹانوں میں کہیں موزوں دُرِ شہوار ہوتے ہیں
نہیں آتشکدوں میں وہ جو گرمی برف جاڑوں کی — سمندر میں کبھی چلتی نہیں کشتی پہاڑوں کی
غلاظت کی تہوں میں نکہتِ گُل بہہ نہیں سکتی — ہجومِ ابرِ تر میں دھوپ قائم رہ نہیں سکتی

بڑھو اور ایک ٹھوکر مار کر اس کو فنا کر دو
سب اسکی خشکیوں کو نذرِ طوفانِ بلا کر دو

جوانوں کو بہار افروزِ گلشن کی ضرورت ہے
چمن کو تازہ پھولوں کے نشیمن کی ضرورت ہے

یہ لعنت انجمن کی ہے اگرچہ یارِ شاطر ہے
یہاں اُس کی پذیرائی نہیں جو بارِ خاطر ہے

میری دُعا

میں تری دنیا میں یارب عیش کا جویا نہیں
یہ نہیں کہتا نویدِ عشرتِ ایام دے

رنگ و بُو کی سیج پر سونا مرا مقصد نہیں
یہ نہیں کہتا کہ پھولوں سے بھری اک شام دے

میں متاع و دولتِ کونین کا بھوکا نہیں
یہ نہیں کہتا مجھے تسکین دے آرام دے

ہاں مگر یہ چاہتا ہوں دے مجھے وہ زندگی
ہر نفس میں زندگیٔ نَو کا پیغام دے

زندگی کیا ہے؟ یہ سمجھا دے مرے ادراک کو
میرے ذہنِ نارسا کو قوتِ الہام دے

تو نے اوروں کو بہت بخشی ہے صہبائے نشاط
مجھ کو تو اس بزم میں کچھ ماورائے جام دے

زندگی

رات بھر اوس برستی ہے جو ویرانوں میں — اشک بنجاتی ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں میں

سانس لینے کی نہیں اہلِ لحد کو فرصت — زندگی قید ہے اُن موت کے کاشانوں میں

سامنے آنکھ کے تصویر ہے بربادی کی — کچھ اُجالا بھی ہے اُجڑے ہوئے سامانوں میں

دائمی آج مسلّط ہے اندھیرا جن پر — کل نشاط اُن کی شب افروز تھی ایوانوں میں

خاک سے جن کی شرر خیز ہے طوفانِ حیات — آہ وہ خواب سے سرشار ہیں میدانوں میں

جب مکدر غمِ ایّام سے ہو جاتی ہے
زندگی تھک کے یہاں چین سے سو جاتی ہے

زندگی کیا ہے؟ فقط ایک شبستانِ خموش — اور اک شمع سرِ گورِ غریباں خاموش

زندگی کیا ہے؟ فقط "دودِ چراغِ محفل" — اور اک زلفِ پریشاں جو ہوا آشفتہ بہ دوش

زندگی کیا ہے؟ فنا زار کا لرزاں بادل — ماتمِ موت میں ہے نالہ کناں، محوِ خروش

زندگی کیا ہے؟ فقط شامِ لحد کی اک صبح — صبح کے چاند کی یا ایک کرن جلوہ فروش

زندگی موت کی خاموش اک انگڑائی ہے
بوئے گُل، خوابِ سحر، دور کی شہنائی ہے

مُسافر

(ٹیگور)

خموشی و ظلمت سے صحرا بھرا ہے		لبِ بام شمعوں سے نور و ضیا ہے
ابھی تازگی بھی ہے پھولوں میں باقی		جواں پنکھڑیوں میں بھی نشہ سا ہے
تو کیا وقتِ رخصت قریب آ گیا ہے؟
تو کیا اے مُسافر چلے جاؤ گے تم؟

تمہیں ہم خوشامد سے کب روکتے ہیں		تمہارے نکلنے کے رستے کھُلے ہیں
سواری بھی تیار ہے آستاں پر		مگر سوگ کے دل میں آثار سے ہیں
ہمارا اثر تمہیں روکتا ہے
تو کیا اے مُسافر چلے جاؤ گے تم؟

اک الحانِ بیتاب نے تم کو روکا		ان آنکھوں کے سیلاب نے تم کو روکا
تمہیں روکنے کا نہ تھا ہم کو یارا		مگر اشکِ خوناب نے تم کو روکا
ہمارا تو کمزور ہر آسرا ہے
تو کیا اے مُسافر چلے جاؤ گے تم؟

یہ آنکھوں میں کیسی نئی روشنی ہے یہ کیا آگ سی خون میں دوڑتی ہے
دیا کیا ستاروں نے الہام تم کو کہ دل میں خموشیِ شب بھر گئی ہے
صدا کیا کہیں سے کوئی دے رہا ہے
تو کیا اے مسافر چلے جاؤ گے تم؟

سکوں چاہتا ہے اگر قلبِ مضطر اگر رحم آتا نہیں تم کو ہم پر
کریں گے خموش اپنے چنگ اور بربط بجھا دیں گے شمعوں کو خاموش ہو کر
تمہاری رضا ہی ہماری رضا ہے
تو کیا اے مسافر چلے جاؤ گے تم؟

اندھیرے میں خاموش بیٹھے رہیں گے صدا لرزشِ برگ و گُل کی سُنیں گے
کرے گا نچھاور قمر زرد کرنیں تمہارے دریچوں کے پردے ہلیں گے
یہ پچھلے پہر نے اثر کیا کیا ہے؟
تو کیا اے مسافر چلے جاؤ گے تم؟

آنسو

دل کی اُلجھن کا پیغامی — وہ اک طوفانِ ناکامی
غم کو تسکیں دینے والا — دل کی کشتی کھینے والا
ایک قطرہ اور سات سمندر — ایک انی اور لاکھوں نشتر
پلکوں پر اس کے نظارے — مینہ برسے اور چمکیں تارے
آنکھ میں اس کی لہریں جاری — رخساروں پہ نہریں جاری
گھر گھر آنا ٹپ ٹپ گرنا — آنکھوں کے سوتوں سے جھرنا
بوندسے ملتی جلتی نرمی — تھوڑی ٹھنڈک تھوڑی گرمی
بادل بن کر آنے والا — دل کی پیاس بجھانے والا
پریم نگر کا رہنے والا — من کی بپتا کہنے والا
جھوم کے اُٹھے پریت کے گھر سے — آنکھ پہ اُمڈے دل پر برسے
ایسے ٹپکے ایسا ٹوٹے — جیسے کوئی ستارا ٹوٹے
حُسن کدوں میں نذر کے قابل — لاکھوں ارمانوں کا حاصل

موجِ وفا کا روشن پہلو — دن کو موتی رات کو جگنو
گوہرِ رقصاں عبرتِ داماں — اتنا مہنگا اتنا ارزاں
عشق کی آنکھوں میں آوارہ — حُسن کی نظروں میں پیارا
رات ڈھلے نینوں سے ڈھلکے — دھیرے دھیرے، ہلکے ہلکے

روشن روشن، پیارے پیارے
آنسو ہیں دُنیا کے تارے

ماتمِ ماضی

عظمتِ اسلاف پر کیوں اسقدر روتا ہے تو — موجِ مضطر تھی جو اُٹھی اور فضا میں کھو گئی
مجھ کو اس کا غم نہیں آثارِ ماضی کیوں مٹے — ماتم اس کا ہے کہ دنیا جاگ کر کیوں سو گئی
نوحہ خوانی کا زمانہ ہو چکا خواب و خیال — داغ تھے دامن پہ جتنے اُن کی لَو کم ہو گئی

گلشنِ ویراں کی اس آب ہوا سے درس لے
سر اُٹھا اے نوحہ خواں اور اس فضا سے درس لے

نظمِ نوروز کہنے کی فرمائش پر

(سنہ ۱۹۳۷ء)

کہاں وہ زندگی دل میں کہ رنگینی نمو پائے
کہاں وہ کیفیت باقی کہ حسِ غم بدل جائے

یہ مانا عشرتِ نوروز پر انساں مٹا ہے
مگر غم خانۂ جاوید میں نوروز کیوں آئے

کبھی لمحاتِ زریں سے مری معمور تھی ہستی
انھیں لمحات میں میں نے ہزاروں زمزمے گائے

مگر اب شعریت دل سے ہوئی ہے اس طرح برہم
کہ جیسے اک منور روح تاریکی سے گھبرائے

شگفتِ زندگی کی تازگی جب ہو گئی رخصت
تو فرسودہ حکایت سے کوئی کیا دل کو بہلائے

الٰہی کس قدر ہے قابلِ رحم اُس کی ہستی بھی
بلندی سے گرے جو اور گرتا ہی چلا جائے

اگر حاصل ہو اپنی لغزشوں پہ اختیار اس کو
تو کیوں یہ قطرۂ شبنم بساطِ گُل پہ تھرّائے

دیکھ!

جا تجلّی خانۂ فطرت میں اک دن وقتِ شام
اور خورشید کی کرنوں سے جا کر ہم کلام

پوچھ ان لمعاتِ زرّیں سے مآلِ تازگی
وقتِ رخصت دیکھ ان کا انفعالِ تازگی

باغ میں پژمردہ پھولوں پر وہ ہوں جب نوحہ خواں
دیکھ اس ماتم میں ان کرنوں کی نوحہ کاریاں

دامنِ مغرب میں چند اجڑے ہوئے ایواں بھی دیکھ
ڈوبتے خورشید کا پھر چہرۂ حیراں بھی دیکھ

دیکھ وقتِ شام وہ بادل جو گردِ آفتاب
اس طرح پھرتے ہیں جیسے بحر میں رقصاں حباب

چاہتے ہیں روک لیں خورشید کی جاتی بہار
لیکن اس کوشش میں ہو جاتے ہیں غرقِ نور و نار

اہتمامِ آمدِ شب میں یہ ساری کائنات
کس طرح دل سے بھلا دیتی ہے سورج کی حیات

دیکھ سب کچھ دیکھ لیکن دیکھ کر ناداں نہ بن
فطرتِ عالم ہے یہ سب دیکھ اور حیراں نہ بن

گر یہ منظر بھی ترے دل پر اثر پیرا نہ ہو
فطرتِ عالم اگر اس طرح بھی افسانہ ہو

اختتامِ شب سے پہلے اپنی خلوت سے نکل
ایک دن تاروں بھرے منظر میں میرے ساتھ چل

زرفشاں انجامِ شب پر میں کروں گا تبصرہ
ایک اک تارے کو چُن کر میں کروں گا تبصرہ

دیکھ وہ مشرق کی جانب دیکھ پَو پھٹتی ہوئی دیکھ وہ لیلائے مغرب کی ردا ہٹتی ہوئی

دیکھ ہاں اب دیکھ وہ تاروں کا رنگ اُڑتا ہوا کاروانِ شب کا چہرہ دیکھ گھبرایا ہوا

تو نے وقتِ شام دیکھی تھی ظفرمندی کی موت تیری نظروں سے بھی گذری تھی وہ سرمستی کی موت

اب یہ ہنگامِ سحر تاروں کا پھیکا پن بھی دیکھ دن نکل آنے سے پہلے ان کی یہ اُلجھن بھی دیکھ

دیکھ سب کچھ دیکھ لیکن دیکھ کر ناداں نہ بن
فطرتِ عالم ہے یہ سب دیکھ اور حیراں نہ بن

تو اگر اب بھی نہ سمجھے چڑھتے دریا کا اُتار گر یہ منظر بھی نہ واضح کر سکے اپنا خمار!

ذہن کو تیرے اگر اب بھی ہو انکارِ زوال تجھ کو قائل کر سکے گی ایک انساں کی مثال

دیکھ آغوشِ اجل میں ہے یہ کوئی نوجواں آکے ہم دونوں بھی اس کی موت پر ہوں نوحہ خواں

ہاں جواں مردوں میں تھی اسکی جواں مردی کی دھوم اس نے ٹھوکر سے ہٹایا قلزمِ بادِ سموم

جنگ کے میداں میں اس کا نام تھا گونجا ہوا کل تھا اس کے پاؤں پر باغی کا سر کچلا ہوا

لا تصور میں وہ اس کی شان وہ شوکت وہ بہار جب کہ اسکی ٹاپ سے اُڑتے تھے میداں میں شرار

آج اسکی آنکھ بن کر اس کی حیرانی بھی دیکھ اسکی نظروں میں پریشاں کن پشیمانی بھی دیکھ

دیکھ سب کچھ دیکھ لیکن دیکھ کر ناداں نہ بن
فطرتِ عالم ہے یہ سب دیکھ اور حیراں نہ بن

دورِ ایام پر تبصرہ

خیابانِ تصور میں نقوشِ زندگی اُبھرے
شفق کی طلعتیں بنکر نشانِ بے خودی اُبھرے

زمانہ ارتقا بر دوش نکلا قعرِ پستی سے
اُٹھا اک کاروانِ ابر اوجِ بزمِ ہستی سے

اُمیدیں زندگی بن کر ہمارے ساتھ رہتی ہیں
ہمارے عہدِ ماضی کے فسانے ہم سے کہتی ہیں

قیودِ رنج و غم وابستۂ امروز و فردا ہیں
ہماری زندگی کے ساز کا پیوستہ نغمہ ہیں

بساطِ دہر پر انسان اک قیدی کی صورت ہے
مسلسل کاوشوں سے پاشکستہ اسکی قسمت ہے

کئی صدیاں گزرتی ہیں تو اک تقدیر بنتی ہے
مکمل اہلِ گلشن کے لئے زنجیر بنتی ہے

ہزاروں پھول کھلتے ہیں جب اک تازہ سمن پارہ
بڑی مشکل سے بنتا ہے سوادِ شام کا تارہ

ہزاروں باغ اجڑتے ہیں جب اک رنگیں گلِ رعنا
مشام افروز ہوتا ہے کسی کافر دوشیزہ کا

ہزاروں خون کے قطروں کا قتلِ عام ہوتا ہے
تو اک شاعر کو شعرِ تر کوئی الہام ہوتا ہے

ہمارے حال کی بنیاد ہے اک شامِ دوشیں پر
نقاب افگن سنہری زندگی ہے روئے سیمیں پر

نہیں وہ دن مگر آج اُن کی دلیں یاد باقی ہے
گیا وقتِ دُعا لیکن ابھی فریاد باقی ہے

صبا نے آکر دیا ہے مژدہ کہ جشنِ فصلِ بہار ہوگا
چمن چمن نکہتیں بنیں گی کلی کلی پر نکھار ہوگا

کہاں مجھے جرأت تماشا کہ ہوں اسیرِ فریبِ جلوہ
نہیں ہے جب اختیار دل پر نظر پہ کیا اعتبار ہوگا

ہیں جس کے حامل گداز والے وہ آگ دل میں بھڑک تو اٹھی
قفس قفس سے شرار اڑیں گے نفس نفس شعلہ بار ہوگا

بنا یہاں آشیانہ اپنا چمن کی رنگینیاں ہیں ہو کا
فنا کے ہاتھوں سے جو چڑھے گا وہ رنگ کیا پائدار ہوگا

بتا دیا تھا سکوں کا رستہ جہانِ گم گشتگی کو جس نے
خبر نہ تھی اپنی کجروی کا وہ قافلہ خود شکار ہوگا

جگا دیا کاروانِ مشرق کو جس کی بانگِ درا نے آکر
نہ تھی توقع وہ خود ہی اک دن اسیرِ گرد و غبار ہوگا

وفا بہ آہنگ جاں فروشی پھر اس پہ اک مستقل خموشی
یہ جینے آئیں کیا مرتب بڑا کوئی ہوشیار ہوگا

وہی سرِ نیازِ مشرق وہی ہے پھر آستانِ مغرب
تخیلِ کارواں غلط تھا کہ یہ امیرِ دیار ہوگا

کسی کے دل کو نہ دے سکا تو پیام اپنے سکونِ دل کا
نہ ہوگی یکسوئی تیرے دل میں تو فطرتاً انتشار ہوگا

وہ چاند ہو یا کوئی ستارہ وہ پھول ہو یا کوئی شرارہ
جو میرے دل کا سکوں بنے گا وہی مرا رازدار ہوگا

سمٹتا جاتا ہے پھر اندھیرا افق پہ ہے چاندنی سی پیدا
حجابِ منزل میں چھپنے والا وہ چاند پھر آشکار ہوگا

نئی شعاعیں چمک رہی ہیں زمانہ کروٹ بدل رہا ہے
خزاں کی خاموش طلعتوں سے طلوعِ صبحِ بہار ہوگا

یہ اضطراب اور بیکسی کیا، نہ وہ رہیگا نہ یہ رہے گی
قرار تقدیر جس کو دے گی وہ قلب کیوں بے قرار ہوگا

اُٹھی ہے اک آگ انجمن سے چلے ہیں شعلے سفیر بنکر
بنے گا آتشکدہ جگر کب تمہارا دل کب شرار ہوگا؟

نہیں ہے گو تیر میرا نالہ مگر اصولاً یہ کہہ رہا ہوں
جو آسماں سے نکل چکا ہے وہ کیوں نہ سینوں سے پار ہوگا

دیارِ مغرب کا ایک طوفان جو صبحِ مشرق پہ چھا رہا ہے
یہی بدل کر لطافتوں میں کسی دن ابرِ بہار ہوگا

اسی زمیں کی فسردگی سے بہار پھوٹے گی نغمہ بنکر
یہی خموشی کا سحر عالم قیامتِ لالہ زار ہوگا

اُٹھا کے ذروں کو خاک سے پھر گلے لگائے گا مہرِ تاباں
نہ کوئی پامالِ راہ ہوگا نہ خستہ روزگار ہوگا

وطن میں مُڑ مُڑ کے پھرنے والو **ضیا** کا کیا حال پوچھتے ہو
پڑا ہوا دور قافلے سے کہیں سرِ رہگذار ہوگا

وہ شورشِ ہم و بیم بیگانیِ تمنّا
وہ سوزِ محبت کی سرکشانیِ تمنّا

کیا بس کی آگ بھڑکاتی ہیں
اے عشق تیری شعلہ سامانیِ تمنّا

تشنگی

تصور پر گراں دنیائے فانی کی محبت ہے
گرفتارِ جنوں ہر وقت افتادِ طبیعت ہے

اسیرِ جسم و جاں ہو کر فلک پروازیاں کیا ہو
مری روحِ پریشاں بے مزہ و پُر کدورت ہے

تماشائی ہوں منظر کو میں حیرت سے تکتا ہوں
مری اک چشمِ حیراں اور یہ طوفانِ فطرت ہے

الجھتی ہیں نگاہیں امتیازِ حق و باطل میں
کچھ ایسی الجھنوں سے امتزاجِ نور و ظلمت ہے

شرابِ رنگ و بو میں علمِ سمیت ہوا جب سے
مجھے ہر جرعۂ رنگیں سے بیزاری ہے نفرت ہے

کہاں روحانیت باقی ہے اس دنیا پرستی میں
محیطِ عالمِ اجسام مطلق مادیت ہے

مجھے اک خلوتِ بے رنگ میں خاموش رہنے دو
رباب و چنگ کی آواز بھی سامانِ وحشت ہے

مغنّی توڑ کر ہر ساز مجھ کو پُرسکوں کر دے
کہ یکسوئی کی شورش گاہِ عالم میں ضرورت ہے

شوالۂ فطرت

ہمالہ

وہ ایک حدِ آخر جولانیٔ نظر کی / لیلائے شب کا مندر روشن گپھا سحر کی

کرتا ہے پہلا سجدہ سورج اسی آستاں پر / ہیں نغمہ خواں ستارے اسکی ہر آشیاں پر

عالم سے بھی زیادہ رفعت نصیب ہے یہ / عرشِ خدا سے گویا بالکل قریب ہے یہ

دشوار ہے رسائی اسکی بلندیوں پر / ہے جلوہ گاہ فطرتِ معصوم چوٹیوں پر

خاموش کچھ فرشتے جیسے کھڑے ہوئے ہیں / محویتوں کے پردے ہر سو پڑے ہوئے ہیں

ہیں آسماں بدامن گہرائیاں زمیں کی / اک یادگار باقی ہے رفعتِ زمیں کی

نورِ کرشن و بودھ سے معمور ہے ہمالہ / عرفاں کی وادیوں کا اک طور ہے ہمالہ

رفعت تری ہمالہ گو حیرتِ نظر ہے / پروازِ فکرِ شاعر لیکن بلند تر ہے

تو اک حجابِ اکبر، محوِ سکونِ فطرت / شاعر، گرہ کشائے رازِ درونِ فطرت

فکر اسکی اک سرودِ بے نام چھیڑتی ہے / مضراب اسکی سازِ الہام چھیڑتی ہے

جن تیری چوٹیوں پہ پہونچا نہ کوئی انساں / شاعر وہاں پہونچکر ہوتا رہا غزل خواں

جن تیری رفعتوں پہ جمتی نہیں نگاہیں　　شاعر وہاں پہنچ کر بھرتا رہا ہے آہیں
لیکن اب اس پہ جذبہ طاری ہے خامشی کا
تیری ہی طرح وہ بھی ہے منتظر کسی کا

چاند آغوشِ ابر میں

نظر میں حسن اور سکوں کی بجلیاں لئے ہوئے　　چلا ہے کوئی شام ہی سے کارواں لئے ہوئے
یہ ساز باز ہے فلک کا جگنوؤں سے آج کیا؟　　ہے عشرتِ خیال کیوں نیا سماں لئے ہوئے
ہے شوق اگر کوئی تو یہ کہ منزلیں تمام ہوں　　خرام میں وہ جا رہا ہے آندھیاں لئے ہوئے
وہ گردِ رہ غبار بن کے کارواں پہ چھا گئی　　چلا نظر بچائے فکرِ آشیاں لئے ہوئے
اندھیریوں میں حسن کی متاع لٹ گئی نہ ہو　　شریر کیوپڈ آ گیا نہ ہو کماں لئے ہوئے
چلا کہیں ستارہ اپنی راہِ گرم چھوڑ کر　　رواں ہوا قمر ضیائے جاوداں لئے ہوئے

وہ ابر کی تہوں میں زندگی کا نور چھپ گیا
وہ موت آ گئی سکوتِ ناگہاں لئے ہوئے

تاج

جانِ گلشن اور جانانِ بہار جاوداں شمعِ شبستانِ بہار

افتخارِ روزگارِ بے ثبات یادگارِ بزمِ ویرانِ بہار

اک دماغِ صنعتِ مرحومِ ہند اک چراغِ زیرِ دامانِ بہار

عنبریں سبزے پہ مختارِ ارم مرمریں افسر پہ سلطانِ بہار

واقعی تعبیرِ خوابِ حسن و عشق آخری تصویرِ طوفانِ بہار

خامشی کا نغمۂ مواج ہے

"تاج" اب بھی رفعتوں کا تاج ہے

صبحِ جنت کی صباحت اسمیں ہے شامِ گلشن کی لطافت اسمیں ہے

اس کے ہر لمحے میں اک تازہ بہار اک نئی ہر وقت جنت اسمیں ہے

مادیت اس کو چھو سکتی نہیں روح کی گویا حکومت اسمیں ہے

جلوہ کاری کم سے کم اتنی تو ہو دیکھیے جب، ایک ندرت اسمیں ہے

حسن کی جو مایۂ ممتاز تھی اب بھی پنہاں وہ امانت اسمیں ہے

عشرتِ نظارہ کی معراج ہے

"تاج" اب بھی عظمتوں کا تاج ہے

تاج اک بجلی ہے لہراتی ہوئی — اک تجلی کیف میں ڈوبی ہوئی
یا جبینِ حور کی کوئی شکن — اک بیاضِ نور میں لپٹی ہوئی
بام و در سے گنبد و مینار سے — ہر طرف اک چاندنی پھیلی ہوئی
آہ یہ محفل ضیا و حسن کی — چاند تاروں سے مرتب کی ہوئی
اس کے ہر گوشے میں دُرّوں کیطرح — دولتِ کونین ہے بکھری ہوئی

ہے کہیں نیلم، کہیں پکھراج ہے
"تاج" اب بھی صنعتوں کا تاج ہے

وسعتِ کون و مکاں کا آئینہ — جلوہ زارِ کہکشاں کا آئینہ
جس کو دُنیا کھو کے روتی ہی رہی — اُس متاعِ رائیگاں کا آئینہ
ایک بزمِ رفتہ کا ماتم گسار — اک نشانِ بے نشاں کا آئینہ
دلکشا تصویرِ صبحِ انجمن — داستانِ باستاں کا آئینہ
عظمتِ "ممتاز" کی اک جلوہ گاہ — شوکتِ "شاہِ جہاں" کا آئینہ

یادگارِ محفلِ تاراج ہے
"تاج" اب بھی حیرتوں کا تاج ہے

میکدۂ بہار

ہر گُل ہے چھلکتا ہوا پیمانہ چمن میں
کیا صبحِ بہار آئی ہے مستانہ چمن میں

بیدار ہوئے نسترن و نسریں کے شوالے
انداز ملے باغ کو دل چھیننے والے
تاباں ہوئی یوں نشۂ مستی کے اُجالے
جیسے کوئی چادر خم و مینا سے اُٹھالے
کلیوں کے پیالے
شاخوں نے نکالے

جس طرح کوئی کھول دے میخانہ چمن میں
کیا صبحِ بہار آئی ہے مستانہ چمن میں

دلدوز و دل آرا ہیں گلستاں کے نظارے
پوشیدہ ہر اک رنگ میں فطرت کے اشارے
روشن ہیں کنول صبح کے چشموں کے کنارے
اک فصلِ مسرت کے کرشمے ہیں یہ سارے
گُل ہیں کہ ستارے
کلیاں کہ شرارے

جگنو ہے کہ موجِ پرِ پروانہ چمن میں
کیا صبح بہار آئی ہے مستانہ چمن میں

بلبل کے ہیں نغمے کہیں طوطی کی صدائیں
یہ پرسیہ مست، یہ کوئل کی نوائیں
آثارِ سحر کی یہ ضیاریز ادائیں
لبریز ہیں معصوم تجلّی سے فضائیں
گھنگھور گھٹائیں
پُرشور ہوائیں
کیوں چشمِ تماشا نہ ہو دیوانہ چمن میں؟
کیا صبحِ بہار آئی ہے مستانہ چمن میں

افسردگی باغ کا اب ختم ہے عالم
ہر سازِ رگِ گُل کی صدا ہے مُترنّم
ہے صبحِ گلستانِ سحر خلد سے کیا کم
دامانِ صبا کی یہ گُل افشانی پیہم
یہ خندۂ شبنم
یہ صبح کا عالم
پھر پھیل گئی گرمیِ افسانہ چمن میں
کیا صبحِ بہار آئی ہے مستانہ چمن میں

دھنک

فطرتِ رنگیں نوا نے صور اپنا پھونک کر — سینکڑوں جلوے بساطِ بزم پر عریاں کئے

چشمِ بینا کے لئے ہر جلوہ دل آویز ہے — آدمی دیکھا کرے نظارے کو حیراں کئے

بزمِ ہستی کو سجایا لاکھ سامانوں کے ساتھ — ایک افسانے کے قائم مختلف عنواں کئے

گلستاں میں پھول کو دیکر لباسِ رنگ و بو — چاند اور تارے سوادِ چرخ پر تاباں کئے

بھر دیا جامِ شفق میں لالہ گوں خونِ حیات — نقرئی بوندوں کے موتی بحر میں رقصاں کئے

امتزاجِ رنگ سے ترتیب دی دنیائے نو — ابر میں قوسِ قزح کے دائرے رخشاں کئے

جس طرح شیشے میں بھری ہو شرابِ ہفت رنگ — جس طرح بیٹھی ہو دلہن عید کا ساماں کئے

جس طرح وینس کا آنچل اور کیوپڈ کی کماں — تاک میں انسان کی ہو روح کو لرزاں کئے

اے دھنک تو نے نظر کو جنبشِ نو کی عطا — سرنگوں بیٹھا ہوا تھا ماتمِ ارماں کئے

بھر کے نور و رنگ میرے مطلعِ امید میں
مجھ کو اپنا سا بنا لے دامنِ خورشید میں

تصوّر

ہم آج اپنے خیال میں اک حسین محفل سجا رہے ہیں
یہ ہے تصور کی سحر بازی کہ بام و در جگمگا رہے ہیں

حدودِ ظاہر کی بندشوں سے ہے آج آزاد اپنی دنیا
ہے وقت پر اقتدار اپنا ہم اسکو اپنا بنا رہے ہیں

کبھی ہے فرشِ زمیں پہ تکیہ کبھی نشیمن ہے آسماں پر
غرض کہ دونوں جہاں کی وسعت پہ رنگ اپنا جما رہے ہیں

ہے زندگی اور موت دونوں پہ ہم کو آج اختیار حاصل
ہم اک نئی کیفیت کے کیف و اثر سے ہستی پہ چھا رہے ہیں

کبھی ہے محفل پہ رات طاری کبھی سماں نورِ صبح کا ہے
کبھی ہے تخلیقِ مہرِ روشن کبھی ستارے بنا رہے ہیں

زمیں سے چاند اُگ رہا ہے فلک سے پیدا ہیں لالہ و گل
ہم آج ہیں خالقِ تصوّر نئے کرشمے دکھا رہے ہیں

کبھی ہے موجِ نشاط جاری کبھی جنوں خاک اُڑا رہا ہے
کبھی ہم آندھی میں اُڑ رہے ہیں کبھی سمندر بہا رہے ہیں

چمن میں ہم کو سہار پہ ہم سکوں طلب لالہ زار پہ ہم
غرض دلِ وفگار پہ ہم اب اپنا پرچم اُڑا رہے ہیں

کہیں سے آنا نہ اُٹھ کے جانا وہی ہیں ہم اور وہی ہے خلوت
خیال میں سر جھکا ہوا ہے مزے تصوّر کے آ رہے ہیں

تاریخِ چمن کا ایک ورق

کل جو کلیاں سو رہی تھیں باغ کی آغوش میں
رنگ و بو پر تھی اُداسی محفلِ خاموش میں

نکہتِ بیدار نے اُن کو ابھارا ہی نہ تھا
صحنِ گلشن میں کہیں اذنِ تماشا ہی نہ تھا

حسن و دل آویز میں افسانہ پیرائی نہ تھی
یاد ہیں وہ دن کہ گلشن میں بہار آئی نہ تھی

صبح دم تازہ ہوا آئی جگانے کے لئے
درسِ آدابِ وفا سب کو سکھانے کے لئے

حسنِ فطرت نے چمن کو عشق کی تعلیم دی
اک نیا نغمہ بنا، آہنگِ سازِ زندگی

کھلکھلا کر ہنس پڑیں کلیاں لبِ مسرور سے
شبنمستاں جگمگا اُٹھا ضیائے نور سے

اب تھی صحنِ گلستاں میں حکمرانی پھول کی
پھول ہی تھا ہر طرف یا گلفشانی پھول کی

نازنیں کلیوں میں وہ شہزادۂ حسن و شباب
بزمِ انجم میں ضیا وہ مختصر سا ماہتاب

وہ گلِ نو، نازشِ گلشن، بہارِ زندگی
جس کے سینے میں فروزاں تھا شرارِ زندگی

وہ سراپا رنگ و بو، عنوانِ صبحِ گلستاں
یا مجسّم آتشِ گلزار کا رنگیں دھواں

ہائے وہ کیا وقت تھا مستی فزا ، ہستی نگار
میری نظریں جانبِ گُل جا رہی تھیں بار بار

نرم و نازک پتیوں میں شعلۂ رنگیں کا جوش
نکہتوں کے میکدے میں ایک رندِ بادہ نوش

فطرتِ عالم نے آخر اپنا دُہرایا اصول
دفعتًا یاد آگئی اپنی اُسے رنگین بھول

حاصلِ صد رنگ جس کا دامنِ اقبال تھا
آہ ، وہ گلچیں کے دستِ ظلم سے پامال تھا

اُسکے اوراقِ پریشاں میں تھا پیدا انتشار
توڑ کر جس طرح رکھدے موتیوں کا کوئی ہار

اک نیا برزخ پھر اس کے ہر ورق نے لے لیا
رنگ جو باقی رہا تھا ، وہ شفق نے لے لیا

دہر میں اقوام بھی بنتی بگڑتی ہیں یونہی
بستیاں آباد ہو ہو کر اُجڑتی ہیں یونہی

ہے یہی اس انقلاب آباد کا ماضی و حال
سچ کہا اے کہنے والے " ہر کمالے را زوال "

پھول ، ہو یا خار ہو سب کا یہی انجام ہے
فطرتِ صحرا و گلشن عبرتِ انجام ہے

جو رہِ نیرنگِ جہاں کی تازہ ہوجاتی ہے یاد
زندہ باد اے انقلابِ بزمِ عالم زندہ باد

جگنو

صبح چمن میں ہنستی آئی | گلخانے میں مستی آئی
پھول سے پہلے کلیاں جاگیں | پھل جاگے اور پھلیاں جاگیں
شبنم نے منہ دھویا سب کا | صبح بنی آئینہ شب کا
آئی نسیمِ عطر بدامن | جیسے کوئی مست سہاگن
پودے جھومے سبزا نکھرا | رنگ بھرے گلشن کا نکھرا
شاخِ سمن نے لی انگڑائی | آئی سحر کی دیوی آئی

لے کر رس اور خوشبو آیا | جگنو آیا جگنو آیا
کھلتا اور چمکتا آیا | کلیوں کا منہ تکتا آیا
ہنستا گرتا پڑتا آیا | خاک میں تارے جڑتا آیا
گیت سحر کے گاتا آیا | پھولوں پر منڈلاتا آیا
شب کا جاگا سونے آیا | اپنی ہستی کھونے آیا

گلشن جاگا جگنو سویا — فرزندِ رنگ و بو سویا
گُل ہوئیں شمعیں بزمِ چمن کی — جگنو بن گئی جوت کرن کی
ہر کیاری میں چھپکر سویا — دن کی دھوپ میں روپ بھی کھویا
کلیاں جاگیں جگنو بن کر — رات ہوئی رخصت بو بن کر

انتظار

جھوم کر بادل اُٹھے زلفِ پریشاں کی طرح — بدلیوں میں جوش آیا دل کے طوفاں کی طرح

کالے کالے بادلوں میں برق کی بے تابیاں — تیرتی ہوں جیسے رودِ نیل میں مرغابیاں

دُور تک نظریں پہونچتی ہیں گھٹا کے ساتھ ساتھ — دل اُڑا جاتا ہے ہر موجِ ہوا کے ساتھ ساتھ

دے نہ درسِ اشکباری مجھ کو اے ابرِ بہار — ہیں سمندر جذب تجھ میں اور مرے آنسو ہیں چار

آج تو آیا ہے سرمست و خراب و نغمہ خواں — روز اٹھتا ہے مرے سوز آشنا دل سے دھواں

روز نالوں کی گرج ہے شورشِ جذبات میں — روز داغوں سے چراغاں ہے اندھیری رات میں

ایک بڑی مدت شگفتِ دل میں ہے باقی ہنوز
کر رہا ہوں انتظارِ آمدِ ساقی ہنوز

شبنم اور ستارے

ہیں کاروانِ شب کی خاطر چراغ روشن　　جگنو کی روشنی سے جیسے ہو باغ روشن

خوابیدہ محفلیں سب بیدار ہو گئی ہیں　　بہرِ سیاہ کاری تیار ہو گئی ہیں

نیکی بدی کا مطلق ہے امتیاز غائب　　نازِ غرورِ حاضر، عجز و نیاز غائب

نظارگی ستارے ہیں بامِ آسماں سے　　احساس ہے جو دل میں کہتے نہیں زباں سے

انساں کی غفلتوں پر دل افگار ہو رہا ہے　　تاروں کی انجمن میں کہرام ہو رہا ہے

بہتے ہیں سرد آنسو جب انکی انکھڑیوں سے　　بھرتا ہے ساغرِ گل شبنم کے موتیوں سے

تاریک بام و در سے غفلت برس رہی ہے　　کاشانۂ گنہ پر عبرت برس رہی ہے

احساس سے گنہ کے کرتے ہیں شرم آنسو
شبنم نہیں ہے یہ ہیں تاروں کے نرم آنسو

صبح کی آگ

ہوئی سحر طلوع رات کے بنفشہ زار سے
تجلیاں عیاں ہوئیں فضائے تیرہ تار سے

وہ لیلیٔ شب اور اسکی خوابگاہِ شبنمی
اٹھا کے اپنا خیمۂ حسیں کہیں چلی گئی

جو مستِ خواب تھی اسیرِ ہوش ہو کے رہ گئے
چراغ آسمان کے خموش ہو کے رہ گئے

برس رہا ہے ایک زمزمہ سا آبشار سے
نکل رہا ہے سرخ پھول عقبِ کوہسار سے

پناہ لی سکونِ شب نے قصرِ ماہتاب میں
نئے کنول ہوئے شگفتہ صبح کے شباب میں

ستاروں کے لہو سے اک نئی شفق عیاں ہوئی
رگِ افق سے ایک موج خون کی رواں ہوئی

بچھائی آفتاب نے بساطِ نور رات پر
نمود بن کے چھا گئی حیات کائنات پر

کنارۂ افق پہ ہے اک آگ سی لگی ہوئی
سلگ رہی ہے صبح تک چتا کوئی جلی ہوئی

لرز رہا ہے ایک شعلہ طشتِ لالہ فام پر
کہ بے نقاب آگیا ہے حسن اپنے بام پر

جبینِ صبح سے ابھر چلا وقارِ زندگی
بھڑک اٹھا کنارِ شرق سے شرارِ زندگی

اک آئینہ ہوا بلند ترجمانِ زندگی
ہر اک طرف ہوئی نمودِ داستانِ زندگی

اس آئینہ سے جلوہ بار ہے عروسِ حریت
کرن کرن میں دوڑ رہی ہے عروسِ حریت

دوشیزۂ حیات سے ہوئی ہے لاگ صبح کی
بجھے گی شام تک کسی سے اب نہ آگ صبح کی

نیرنگ

مہرِ تاباں چھپ گیا جو تھا اُجالے کا سبب
چہرۂ شام و شفق پر چھا گئے گیسوئے شب

طائرانِ خوشنوا پہونچے بسیرے کے لئے
قافلے سب رُک گئے آرام لینے کے لئے

ہیں کہیں عشرت کے سامانوں سے خوش عنوانیاں
سر بسجدہ ہیں عبادت میں کہیں پیشانیاں

ہیں گناہوں کی بناہیں رات کی آغوش میں
جاگتی ہیں نیکیاں اس منظرِ خاموش میں

ساری دُنیا سو رہی ہے نیند میں سرشار ہے
میری چشمِ خونچکاں اس وقت بھی بیدار ہے

اک اندھیرا سا ہے میرے ذہن پر چھایا ہوا
کاوشِ فردا سے میرا دل ہے گھبرایا ہوا

عبرتِ اہلِ نظر تاریکی و تنویر ہے
انقلابِ وقت، خوابِ زیست کی تعبیر ہے

ایک حالت پر نہیں قائم نظامِ کائنات
ہے کبھی صبحِ درخشاں اور کبھی تاریک رات

بہارِ آتشیں

آسماں پر ابرِ گلشن کیف در آغوش ہے
ذرہ ذرہ محفلِ ہستی کا مستی کوش ہے

آج ہر غنچے سے فطرت کی برستی ہے شراب
بادۂ شبنم سے سارا گلستاں مدہوش ہے

دے دیئے ہیں فطرتِ رنگیں نے رنگیں پیرہن
نغمۂ شاعر گلوں کے بھیس میں روپوش ہے

طشت میں رکھ کر شگفتہ پھول لائی ہے بہار
مژدہ لے اہلِ چمن گل ریز آئی ہے بہار

آہ لیکن جس کا دل سوزِ الم سے سرد ہو
رنگ جس کا صورتِ برگِ فسردہ زرد ہو

جس کے دل پر ایک عالمِ یاس کا طاری رہے
ہوک سی دل میں اٹھے پیدا جگر میں درد ہو

سازِ عشرت میں جسے ہو سوزِ ماتم کی تلاش
جس کا تن پُرخاک، جس کی روح بھی پُر گرد ہو

آگ کا اک کھیل ہے رنگِ جہاں اُس کے لئے
فی الحقیقت موسمِ گل ہی خزاں اُس کے لئے

سمندر کے کنارے

غروبِ آفتاب ہے   ورودِ انقلاب ہے
یہ جلوۂ شہاب ہے   کہ موجۂ شراب ہے
ہو جیسے رنگِ آفتاب
ہو جیسے حُسنِ پُرشباب
تہِ نقاب و بے نقاب
خرابِ نغمۂ و رباب
عجب سکوتِ شام ہے   عجیب انتظام ہے
یہ اشتہارِ عام ہے   کہ داستاں تمام ہے
وہ آفتاب چُھپ چلا
وہ دورِ تیرگی بڑھا
فضا ہے ظلمت آشنا
کہ جیسے چھائی ہو گھٹا

نہ اب ہے وہ طلائی رنگ — نہ اب وہ ساز ہیں نہ چنگ

نہ دل میں ہے کوئی اُمنگ — ہوئی فنا ہر اک ترنگ

چلو اُٹھو ضیا چلیں

یہاں ٹھہر کے کیا کریں

غروبِ آفتاب ہے — قریب وقتِ خواب ہے

پھُولوں سے باتیں

میں اک آفت رسیدہ بزمِ شورش سے گریزاں ہوں — بہ ہر سُو اس جہاں میں صورتِ نکہت پریشاں ہوں

تمہارے پاس آیا ہوں میں دُنیا سے جُدا ہو کر — مجھے تسکین دو پھولو، مرے درد آشنا ہو کر

اماں آفات سے رنگینیٔ آغوش میں دے دو — جگہ تھوڑی سی اپنی محفلِ خاموش میں دے دو

زمانہ مجھ سے شاکی ہے میں برگشتہ زمانے سے — تمہاری طرح میں واقف نہیں ہوں مُسکرانے سے

تمہاری یہ حسیں کلیاں پیامِ فکر دیتی ہیں — یہی رنگینیاں دامن کو اکثر تھام لیتی ہیں

کبھی رہتے ہو تم خاموش شانِ بے نیازی سے — کبھی تم مسکراتے ہو ادائے دلنوازی سے

مجھے ہے رشک اے پھولو تمہاری زندگانی پر — نگاہیں ہیں مری، اک انقلابِ بزمِ فانی پر

مری ہستی ہے پژمردہ مگر قسمت شگفتہ ہے

مجھے باغِ جہاں میں گلفشانی کی تمنّا ہے

شمعِ آویزاں

پھول کے دامن میں جب جگنو چمک کر سو گیا
جب اُجالا سا کناروں پر اُفق کے ہو گیا
سوئے مغرب چاند جب آسودۂ منزل ہوا
صبح کا تارا غبارِ جادۂ محفل ہوا
آتشِ جرم و گنہ کا ترجماں بنتا ہوا
قلبِ ہستی سے دُھواں اُٹھا فغاں بنتا ہوا

جانبِ مشرق یہ روشن کر دیا کس نے چراغ
آفتابِ صبح کا جس سے فروزاں ہو دماغ
جس طرح وسطِ سمندر میں کوئی مینارہ ہو
اور اُس کی روشنی موجوں پہ تابش بار ہو
آ رہا ہو جیسے ہندلی روشنی میں اک جہاز
اور عرشے پہ ہو اُس کے شمع اک جلوہ طراز

اے چراغِ دُور تو ہے چاندِ صبحِ عید کا
آئینہ تجھ میں نظر آیا مجھے اُمید کا
محفلِ مشرق کا ساقی پھر بلاتا ہے مجھے
پھر پیامِ دورِ ماضی یاد آتا ہے مجھے
تو نے دیکھا ہے تماشا جگنوؤں کا رات بھر
محفلِ عالم پہ تھی چھائی ہوئی تیری نظر
چھیڑ افسانہ کوئی یا داستانِ شب سُنا
شام سے جو سُن رہا تھا تو، وہ باتیں اب سُنا

شام تک تو گُل رہے گا قبرِ ویراں کی طرح | پھر کرینگے تجھ کو روشن ماہِ تاباں کی طرح
جس طرح انسان سو جاتا ہے سارے دن کے بعد | اور پھر ہوتا ہے زندہ راحتِ ممکن کے بعد
جس طرح کھلتی ہیں کلیاں اور بنجاتی ہیں پھول | جیسے کرتی ہے اندھیری رات کی دیوی قبول

زندگی اور موت سے سارا جہاں معمور ہے | مدتیں گزریں کہ فطرت کا یہی دستور ہے

اے چراغِ دُور کیا تو پھر فنا ہونے کو ہے | کیا بھڑک کر جذبِ دامانِ فضا ہونے کو ہے
ہاں ٹھہر میں آخری تیری بہاریں دیکھ لوں | یہ تری بجھتی ہوئی زرّیں شعاعیں دیکھ لوں

ہے طلوعِ صبح تیری فطرتِ نازک پہ شاق
الفراق اے صبح کے رنگیں شرارے الفراق

بے ولولۂ عشق جوانی گذری
بے کیفِ بہارِ جاودانی گذری
تھا شورشِ عالم سے نہ کچھ کام ہمیں
خاموش ہماری زندگانی گذری

تاج

(شبِ ماہ میں)

ریاضِ تاج سا مسکن کوئی بنا نہ سکا　　بنا سکا بھی تو دنیا کو راس آ نہ سکا

ہماری دولت و عظمت تو چھن گئی لیکن　　یہ چیز وہ ہے جسے کوئی بھی چرا نہ سکا

یہ تاج اور یہ جھکی ہوئی شبِ مہتاب　　یہ ایک ربط جواب تک سمجھ میں آ نہ سکا

یہ آئینہ کہ جسے امتداد نے نہ چھوا　　یہ تاج جس میں کوئی انقلاب آ نہ سکا

ہمارے ذہن نے کھینچے ہزار ہا خاکے　　مگر یہ چاندنی راتیں کوئی بنا نہ سکا

یہ کیفیت یہ ہوا یہ خموشئ دریا　　زمیں نگل نہ سکی اور فلک مٹا نہ سکا

یہاں جو آگیا سارے جہاں کو بھول گیا　　جو اس کو دیکھ گیا عمر بھر بھلا نہ سکا

یہی ہے دل میں اسے جذب کر کے لے جاؤں
کوئی نہ دیکھے تو آنکھوں میں بھر کے لے جاؤں

یہ تاج یہ شبِ مہتاب اور یہ تزئیں　　زمیں سے تا بہ فلک ایک عالمِ نوریں

سوادِ تاج میں یہ کوندتے ہوئے پتھر　　یہ لعل اور جواہر کے پارہ ہائے حسیں

ملی ہے چاندنی راتوں میں ان کو زیبائش
سحر فروش ہے ان کی نمائشِ زرّین

جوانیوں کے نشے سے جھکی ہوئی آنکھیں
یہ بادہ رنگ حسینوں کے کاروانِ حسین

وہ ایک گوشے میں سمٹی ہوئی سی تاریکی
یہ لالہ زار میں بہتی ہوئی سی اک تمکین

یہ ایک خوابِ محبت کی دلنشیں تعبیر
جو نور و رنگ سے مل کر ہے اور بھی رنگیں

عروسِ تاج سے مہتاب کی ہم آغوشی
غضب تھا یہ ہے کوئی ان کو روکتا بھی نہیں

سرور و کیف کا اک دل نواز گھر ہے یہ
ضیاؔ ہماری ہی اٹھتی ہوئی نظر ہے یہ

جب تاج میں ہم ضیا کبھی جاتے ہیں
آنکھوں میں تجلی سی لہراتے آتے ہیں

تاریکی سی گھر سکوت سنانے لگے
سمجھ نور و ضیا جدا کئے آتے ہیں

چاند سے

آہ، تو آوارۂ افلاک کیوں ہے اے قمر
مرکزِ تنویر، کیوں تیرا نہیں ہے مستقر

اک مکمل حسن تیرا جلوۂ شاداب ہے
تو مگر ہر وقت گردش میں ہے اور بیتاب ہے

آسماں کی گود میں مانندِ کشتی ہے رواں
کس طرف ساحل ہے تیرا، تیری منزل ہے کہاں

نور سے معمور کر دیتا ہے تو جذبات کو
تیرتے ہیں تیری کرنوں میں ستارے رات کو

میری اور تیری مگر اے چاند اک حالت نہیں
آسماں تجھ کو دیا خالق نے اور مجھ کو زمیں

چاندنی میں تیری دنیا مستِ محوِ خواب ہے
میں ہوں اور پہلو میں میرے اک دلِ بیتاب ہے

اس لئے محبوب ہے تو اے مہِ انور مجھے
بخش دیتا ہے سکونِ زندگی اکثر مجھے

جاگتی ہے روح تیرے نورِ عالمگیر سے
جوش اٹھتا ہے سمندر میں تری تنویر سے

تیری فطرت سے تجلی آشنا کوئی نہیں
سو رہی ہے ساری دنیا جاگتا کوئی نہیں

ابتدا ہے نور تیری انتہا بھی نور ہے
گھٹنا بڑھنا یہ ترا اک دائمی دستور ہے

بزمِ ہستی کے ہزاروں راز ہیں تجھ میں نہاں
عالمِ بالا کا تو ہے سب سے پہلا رازداں

فکرِ دنیا جب کسی غم میں ڈبوتی ہے مجھے
تیرے نظارے سے اک تسکین ہوتی ہے مجھے

جگنو کی سیر

خوابگاہِ نسترن میں جب اندھیرا ہو گیا
چاندنی کا پھول بھی جب سر خمیدہ ہو گیا

کھل گئے تارے فلک پر نور باری کے لئے
کہکشاں پیدا ہوئی ظلمت نگاری کے لئے

بزم میں شمعیں جلیں رنگِ فضا روشن ہوا
خانۂ دہقاں میں مٹّی کا دیا روشن ہوا

جگنوؤں سے ہو گیا پُر نور ایوانِ چمن
برق پارے ہو گئے وجہِ چراغانِ چمن

گھاس کے پتوں میں ہر جگنو نے لی انگڑائی سی
ایک دنیائے شرر پروانہ پر مائل ہوئی

پھُول پر رقصاں ہوا کلیوں پہ ضو افشاں ہوا
بزمِ رنگینِ چمن میں نور کا ساماں ہوا

کوئی برگِ گل پہ آنسو بن کے تھرّانے لگا
کوئی آغوشِ ہوا میں نور برسانے لگا

کوئی تاروں کو پیامِ رنگ و بُو دینے چلا
چاند کو کوئی نویدِ آبرو دینے چلا

شمع روشن کرنے کوئی سوئے گورستاں گیا
کوئی بن کر مشعلِ جادہ ضیا افشاں گیا

کچھ اُڑے موتی سے دریا کے کنارے جڑ دیئے
لوٹ کر آئے تو شاخوں پہ ستارے جڑ دیئے

جگنوؤں کی سیر سے ہے اک طلسمِ نور باغ
جیسے لاتعداد جلتے اور بجھتے ہوں چراغ

شامِ گلشن ان سے، صبحِ عالمِ ایجاد ہے
یہ بھی ہیں آزاد ان کی سیر بھی آزاد ہے

روز ہوتا ہے روانہ شام کو یہ کارواں — صبح کے دامن میں ہو جاتا ہے بالآخر نہاں

شام کو تنویر در کف پھر نظر آتا ہے یہ — پھر سحر کے نور میں معدوم ہو جاتا ہے یہ

سیر کرتا ہے جگنو ہر بلند و پست کی — دیکھ آتا ہے ادائیں بزمِ بود و ہست کی

ہر طرف تاریک آتی ہے نظر دنیا اسے — ہر طرف طوفان ملتا ہے گناہوں کا اسے

دیکھتا ہے منزلِ ہستی بہت دشوار ہے — قافلہ خوابیدہ - غافل قافلہ سالار ہے

دیکھتا ہے ہر طرف لعنت جفا و جبر کی — ہر طرف طاری نظر آتی ہے ظلمت قبر کی

تیرگی کے خوف سے روپوش ہو جاتا ہے وہ
جھاڑیوں میں خستہ و خاموش سو جاتا ہے وہ

ہیں خاک میں سب کی ہوں سرِ سجدہ پیدا
ہے جھکنا ہو جائے کہیں سجدہ پیدا

اڑتا ہے صحرا میں ہوں جبینِ سجدہ تیری
ہر ذرۂ خاک سے ہے سجدہ پیدا

ایک فوّارہ در آغوشِ شام

ساری فضا کو گھیر لیں جذبۂ اضطراب سے
رنگ جبیں پہ پھیر لیں جلوۂ ماہتاب سے

آکہ یہ محفلِ حسیں کیف سے بادہ بار ہو
آکہ کنول پئیں شراب کھلتے ہوئے شباب سے

زندگی ایک رقص ہے، رقص ہے جامِ زندگی
گردشیں جب تک آئیں پاس کھیل ہی لیں رباب سے

موجِ شباب جابجا، نہرِ شراب جابجا
لالہ و گل کو حکم دو جام بھریں شراب سے

مہکی ہوئی گلابیاں، بہکی ہوئی جوانیاں
جیسے کئی حسیں اُٹھیں پردہ سرائے خواب سے

ذوقِ نظر کا واسطہ مجھ کو یہاں مٹا ہی دے
خشکیٔ زہد تا کجا موج بنا۔ بہا بھی دے

رنگ نئے نئے سجے ہیں محفلِ رنگ ساز میں
جذب ہیں کل حقیقتیں آئینۂ مجاز میں

جام مجھے دکھائے کیوں خون مجھے رلائے کیوں
مجھ کو نصیب لائے کیوں بادہ ستانِ ناز میں

اُبلی زمین سے شراب بھر گیا جامِ ماہتاب
عجز نہ تھا جو باریاب فطرتِ سرفراز میں

صرفِ قیام و سجدہ ہے نشو و نمائے کائنات
جیسے کوئی نیاز مند محویتِ نماز میں

مست نہ کر ٹھہر ٹھہر جوشِ شرابِ موجِ گل
سجدہ تو اک ادا کروں بارگہِ نیاز میں

ہاں آج جہاں سراب ہے بھولا ہوا سا خواب ہے
جیسے بکھرے ہوئے ہوں پھول نرگسِ نیم باز میں

مستیٔ لالہ زار میں ذوقِ نظر خراب ہے
سب یہ فریبِ رنگ و بو شعبدۂ شباب ہے

لیلیٔ شب کی دوش پر زلفِ درازِ شام ہے
پردۂ شب میں ہے روا دن کو جو شے حرام ہے

پی کے مجھے پلائے جا کیف مرا بڑھائے جا
ہاں وہی نغمہ گائے جا روح کا جو پیام ہے

ساری متاعِ میکدہ جذبِ نگاہ ہو گئی
پھول کا رنگ ہے شراب لالے کا پھول جام ہے

دورِ جہاں ہے خوشگوار گو وہ فریب ہی سہی
رنج ہو یا سرور ہو کس کو یہاں قیام ہے

ہو گئی رخصت انجمن اور ہر احتشام بھی
صبح بھی ہو گئی وداع ہے گذرانِ شام بھی
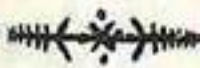
غمگین نہ ہو شورشِ محن سے پہلے
افسردہ نہ ہو شامِ چمن سے پہلے
تو آمدِ غم سے کیوں گھلا جاتا ہے
ہنستا رہا جا یہ بھی سہن سے پہلے

آبشار

جب بے خودی ہی ٹھہری رُخ پر حجاب کیسا
آزاد اگر ہو نغمہ ساز و رباب کیسا

ہر وقت اک تبسم رقصاں بھی اور رواں بھی
فطرت بہار ہی ہے اپنا شباب کیسا

دیتا ہے رقص تیرا تسکیں ہر اک نظر کو
کیا جانے پھر ہے تجھ میں یہ اضطراب کیسا

تعبیر کی طلب میں تو ہے رواں مسلسل
دیکھا ہے تو نے شامِ ہستی میں خواب کیسا

سنسان وادیوں میں کیوں گیت گا رہا ہے؟
صحرا ہے دیکھ تیری لَے سے خراب کیسا

اے اشکِ قلبِ فطرت یہ جوش یہ روانی
یہ تیرا کارواں ہے، پا در رکاب کیسا

کیا کوہسار حالِ عالم پہ رو رہا ہے؟
آیا ہوا ہے یارب یہ انقلاب کیسا

گنجائشیں ہیں گی باقی نہ جذبے میں میں
ہوگا جہاں میں برپا طوفانِ آب کیسا

ایسا ہی میرے دل میں ہے آبشار جاری
یہ سوزِ غم کا یارب پھر التہاب کیسا

داغِ جگر کی حدت اب تک وہی ہے باقی
قلزم میں جلوہ گر ہے یہ آفتاب کیسا

تیار آنے والا طوفان ہو رہا ہے
میں دل کو رو رہا ہوں دل مجھ کو رو رہا ہے

وادیٔ چناب کی ایک شام

اک طرف کہسار ہیں شاداب و رفعت نشاں
دوسری جانب ہے اک دریا خموشی سے رواں

اک طرف یہ اوج و شوکت، یہ مناظر دلفریب
دوسری جانب کنارِ بحر و میدانی نشیب

کوہ کے دامن میں جا کر چھپ رہا ہے آفتاب
یا طلائی رنگ سے لبریز ہے آبِ چناب

رفعتِ کہسار بھی اور آبِ دریا بھی خموش
سبزۂ ساحل بھی ساکت اور صحرا بھی خموش

وادیاں سنسان ہیں بزمِ چمن بھی ہے خموش
پھول اور کلیوں کی رنگین انجمن بھی ہے خموش

جس طرف بھی دیکھیے اب حکمراں ہے خامشی
کوہ پر طاری ہے دریا میں رواں ہے خامشی

کوہ کی چوٹی سے ہے تخلیقِ تصویرِ ہلال
اور اک چھوٹا سا تارہ حاشیہ گیرِ ہلال

جیسے اک خاموش دوشیزہ برائے سیرِ شام
کر رہی ہو اپنی جلوہ ریزیوں کا اہتمام

کاروانِ شب افق سے ہر طرف بڑھتا ہوا
اک اندھیرا سا سوادِ کوہ پر چڑھتا ہوا

ریل کی وہ سنسناہٹ خامشی میں شام کی
تیز رَو بجلی کی موجِ آب پہ پڑتی ہوئی

عکس سے اس روشنی کے وہ چراغانِ چناب
جیسے موجوں سے نکل آئے ہزاروں ماہتاب

حیرتِ نظارہ تابِ دید لا سکتی نہیں
دیکھ تو سکتی ہے اوروں کو دکھا سکتی نہیں

راز تسکیں ہے سکوتِ بحر کے پیغام میں
افتخارِ کوہ ہیں حسنِ خموشِ شام میں

چاہتا ہے دل کہ ہم بھی پڑ رہیں آ کر یہیں
اس سکوں آباد میں کچھ روز ہو جائیں مکیں

رُخ نظر آتا ہے روشن گردشِ ایّام کا
آفتابِ صبح ہے گویا ستارہ شام کا

گوارائی

مجھے وحشت سی ہے ہنگامہ آرائیِ محفل سے
سبب کیا پوچھتا ہے ہم نشیں مجبور ہوں دل سے

مجھے شورش سے نفرت ہے میں شورش سے گریزاں ہوں
جو ممکن ہو ابھی اُٹھ جاؤں شورش گاہِ محفل سے

خموشی رہنما بنتی ہے موجوں کے تھپیڑوں میں
صدا تسکین کی دیتا ہے کوئی مجھ کو ساحل سے

مگر جذبہ گوارائی کا جب دل میں مچلتا ہے
فضا کو گردشیں دیتا ہوں موسیقی بھرے دل سے

مجسم روح بن جاتا ہے منظر بزمِ فطرت کا
بصیرت جب ابھرتی ہے حقیقت آشنا دل سے

صدائے سازِ فطرت جب مجھے بے خود بناتی ہے
فضائے ہوش میں پھر لوٹ کر آتا ہوں مشکل سے

میں گُم ہوتا ہوں نغمے میں جو بادل سے برستا ہے
کہ جیسے موج مل جاتی ہے محویت میں ساحل سے

تبسم اُس ترنم کے اثر سے روح کرتی ہے
جو ہلکے سُر میں بہتا ہو کسی ڈوبے ہوئے دل سے

مجھے ایسی فضاؤں میں ہمیشہ مست رہنے دو
کہ میں کترا گیا ہوں شورشِ یارانِ محفل سے

خوابگاہِ شاہجہاں

زندگی جس کی بسر ہو جلوہ گاہِ ناز میں
عظمتیں جھکی ہوئی ہوں جس کے ہر انداز میں

جس کو جھک جھک کر کرے فخرِ شہنشاہی سلام
فرِّ سلطانی ہو جس کے محرمانِ راز میں

ہند کی وسعت میں جس کی گونج سی ہو زلزلہ
جس کے لفظوں میں تلاطم ہو، گرج آواز میں

جس کے زورِ پاسے قلبِ ارض کو تسکین ہو
اور نورِ عرش چمکے ذہنِ سرافراز میں

چھیڑ دے جس کا تبسم چشمۂ کوثر کا راگ
شعلے ہوں جس کی نگاہِ صاعقہ پرواز میں

خلد پائیں باغ ہو جس کے حریمِ ناز کا
نغمے لاکھوں پرورش پاتے ہوں جسکے ساز میں

ہوں بہاریں منتخب جسکے ریاضِ ذوق کی
حسن ہو اک شمع جس کی محفلِ ممتاز میں

اُس کو مر کر بھی نشاط و رنگ ہونا چاہیے
خاک پر بھی صاحبِ اورنگ ہونا چاہیے

یہ جہانِ رنگ و بو میں مرمریں اک خوابگاہ
جس میں دنیا کی بہاریں آکے لیتی ہیں پناہ

مرحبا یہ قصرِ نور افروز و ایوانِ بلند
اب بھی جھک جاتی ہے اکثر جسکی ہیبت سے نگاہ

اب بھی مہتابی پہ ہے ممتاز گویا محوِ خواب
شہ نشیں پر اب بھی گویا جلوہ گر ہے بادشاہ

اس طرح ہم خواب ہیں ماضی کی دو تابانیاں
جیسے برجِ سنبلہ میں ہو قرانِ مہر و ماہ

وصل وہ ہے جو رہے باقی فنا کے بعد بھی
عشق کے مذہب میں ترکِ حسن ہے مطلق گناہ

ہر روش پر ہیں کمربستہ غلاموں کی طرح
غنچہ و گل نذر کرنے کے لئے تاج و کلاہ

ہے ابھی تک مسند آرائے جہاں شاہِ جہاں
تاج اس کے فرق پر ہے اس حقیقت کا گواہ

آفتابِ سطوتِ ماضی ہے تابندہ ہنوز
ہاں وہ زندہ ہے کہ اس کا نام ہے زندہ ہنوز

فنا زار

کاہشِ غم مجھے لائی جو بیاباں کی طرف
میں نے ہر ذرے میں ماتم کدہ پنہاں دیکھا

نوحہ خواں صبح کو پایا رخِ نور افشاں کا
شام کو ماتمی زلفِ پریشاں دیکھا

ایک دنیا تھی کہ تھی شمع کی صورت خاموش
ایک محفل تھی جسے خفتہ و ویراں دیکھا

خاک سے اٹھتی ہوئی موت کی لو آئی نظر
رگِ ہر خار سے عبرت کو فروزاں دیکھا

تھا ہر ایواں پہ یہ کتبہ کہ میں ہوں بزمِ فنا
لاکھ افسانوں کا یہ ایک ہی عنواں دیکھا

ادب و عجز سے جس سمت نظر جاتی تھی
روح میں خوف کی اک لہر اتر جاتی تھی

سردی کا چاند

کل فلک پیما تھا نظارہ شراروں کی طرح
آج خواب آلود ہے ڈوبے ستاروں کی طرح

حسن کیا ہے جب نہ ہو اس میں محبت کا جنوں
کیا اثر ہو ساز کا جب تک نہ ہو سوزِ دروں

آج کوئی لے گیا اس کی بہاریں لوٹ کر
جس میں کل بھر دی تھی فطرت نے لطافت کوٹ کر

موجِ بادہ دفعتاً بے جوش ہو کر رہ گئی
پھول کی اک پنکھڑی خاموش ہو کر رہ گئی

موسمی آثار ہیں گم ہونے والے اے چراغ
کیا ہوئی جو گرم رکھتے تھے ترے سینے کو داغ

روشنی تیری مگر اک آہِ بے تاثیر ہے
آج سرد آتش میں ڈوبا ساکی کا تیر ہے

چاند اور سورج میں خندہ ہے فطرت کی ضیا
دن کو آتش بار ہے اور شب کو ٹکڑا برف کا

بجھ گئی ہے یوں ترے سینے سے رعنائی کی آگ
جس طرح اجڑا اجڑا ہو ایک بیوہ کا سہاگ

عشق کی گرمی سے دنیا کی فضا کو رام کر
از سرِ نو پھر ابھر کیوپڈ کا دامن تھام کر

تیری رگ رگ سے عیاں ہونے لگیں جب بجلیاں
اپنی منزل کی طرف چل لیکر اپنا کارواں

تیرے دل میں ہو اگر نورِ حقیقت جلوہ گر
ضوفشاں تو بھی رہے میری طرح شام و سحر

کیفِ صہبائے محبت سے جو شیریں کام ہوں
دیکھ اس سردی میں بھی صد شعلہ بر اندام ہوں

سوزِ اُلفت باعثِ نشو و نمائے حسن ہے　　بزمِ فانی میں محبت سے بقائے حسن ہے

حسن اگر بے سوز ہے اک سازِ بے آوازہ ہے
سوز ہی میں حسن کی تابندگی کا راز ہے

آسودگانِ خاک سے

کیا تمہیں رنج ہے دُنیا سے چلے جانے کا　　کچھ بتاؤ تو سہی قبر میں سونے والو
آج کیوں نطق سے خالی ہیں تمہاری باتیں　　زندگی میں کبھی خاموش نہ ہونے والو
چھین کر لے گئی کیا روح تمہارے دل کو　　اے زمانے کو رُلا کر بھی نہ رونے والو

کچھ تو اُس عالمِ باقی کی خبر دو مجھ کو
خوابِ ہستی میں ہوں ہشیار تو کر دو مجھ کو

کیا وہاں خاص تماشا ہے نظر کش کوئی　　یا اجازت کبھی ملتی نہیں انگڑائی کی
کیا کسی طرفہ نظارے میں وہاں محو ہو تم　　سامنے ہے نئی دُنیا کوئی رعنائی کی
شام کیسی ہے وہاں اور سحر کیسی ہے　　کچھ کہو حال، قسم ہے تمہیں تنہائی کی

کس فضا میں سحر و شام بسر ہوتی ہے
عالمِ روح میں کس طرح گذر ہوتی ہے

فسونِ شام

ایک دن میں سیر کو جنگل میں جا نکلا ضیا
ساتھ میرے صرف اک میرا دلِ مغموم تھا

آسماں تھا سُرخ جیسے اک سمندر آتشیں
شام کا تھا وقت اور چھایا ہوا تھا جھٹ پٹا

دلکشی منظر کی آخر کام اپنا کر گئی
دل ہوا بے چین دامن کش ہوئی ٹھنڈی ہوا

رُک گیا میں اک جگہ پھولوں کا جمگھٹ دیکھ کر
اُنکی خوشبو سے مرا دل مست اور مسرور تھا

خامشی تھی اُن کی فطرت میں تھا خاموشی پسند
میری صحبت سے یہ منظر کچھ دوبالا ہو گیا

تھا جواب انکی خموشی کا مرا ذوقِ سکوت
میرے اور اُن کے سوا کوئی سمجھ سکتا نہ تھا

بند کلیاں تھیں تبسم کے اثر سے بے حجاب
جذبۂ مسرور سے ہر پھول تھا اک گُل کدا

پُرسکوں تھی اپنی حد تک محفلِ آزادگان
کیف آگیں تھے پرند اور مست تھی ساری فضا

کھو گیا اس منظرِ دلکش کی نیرنگی میں ہوش
رات کی گہرائی میں جیسے سمندر ہو خموش

آباد ویرانہ

بستیوں سے دور ویرانے میں ہے اک خوابگاہ
خاک میں آسودہ ہیں کچھ جلوہ ہائے بے پناہ

سایہ افگن ہیں خموشی سے تناور کچھ درخت
اور ہے چاروں طرف ہنگامۂ برگ و گیاہ

طائر اپنے آشیانوں میں چلے جاتے ہیں جب
ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے تا حدِ نگاہ

شورشوں سے پاک یہ منزل ہے لیکن دور سے
آتی رہتی ہیں گڈریوں کی صدائیں گاہ گاہ

اور کچھ دلچسپ ہو جاتی ہے یہ بزمِ سکوت
جھوم کر اٹھتا ہے جب چاروں طرف ابرِ سیاہ

عبرت و حیرت ہے اس ماحول سے بالکل قریب
دور کوسوں اس کی سرحدِ مقدس سے گناہ

یوں نظر آتا ہے سبزہ زار پہ نقشِ مزار
جیسے جنت میں بنالی ہو کسی نے خانقاہ

وہ سکوں در اصل ہوتا ہے یہاں آکر نصیب
جستجو میں جس کی رہتے ہیں گدا و بادشاہ

اے کہ تو سعیِ سکوں میں اتفن آلودہ ہے
دیکھ لے ہنگامۂ عالم یہاں آسودہ ہے

میں نظّارہ کیوں کروں؟

اگر بامِ فلک پر شب کو تارے جھلملاتے ہیں
گلستاں میں اگر پھول اور غنچے مسکراتے ہیں

اگر دشت و چمن میں چاندنی سونا بچھاتی ہے
ہوائے سرد نغموں سے اگر بادہ پلاتی ہے

اگر موج آفریں کوثر ہے رنگیں آبشاروں میں
ندی گر مست ہو کر گونجتی ہے لالہ زاروں میں

شبِ تاریک ہیبت سے اگر اپنی ڈراتی ہے
اگر سنسان راتوں میں سٹیری گیت گاتی ہے

سحر کے وقت اگر سورج بساطِ زر بچھاتا ہے
اُفق کے ہاتھ میں رنگِ شفق مہندی لگاتا ہے

سمندر میں اگر انگڑائی لینے موج آتی ہے
ہوائے تند صحرا میں بگولے گر اُٹھاتی ہے

اگر کالی گھٹائیں جھوم کر مستانہ اُٹھتی ہیں
ابابیلیں لبوں میں لے کے گر افسانہ اُٹھتی ہیں

اگر وقتِ سحر شبنم چمن کا منہ دُھلاتی ہے
ہوائے تازہ صحرا میں مسافر کو سُلاتی ہے

اگر دریا میں ہوتی ہے خدائی ناخداؤں سے
اگر طوفان اُٹھتے ہیں سمندر کی ہواؤں سے

مناظر کو اگر دعویٰ ہے نظروں کے لبھانے کا
اگر ہے زعم باطل کو حقیقت کے چھپانے کا

بلندی فخر کرتی ہے اگر ان کوہساروں پر
اگر ہیں گلکدوں کو نازشیں اپنی بہاروں پر

تو آخر مجھ کو حاصل کیا ہے ان فطری مناظر سے
ہجومِ لالہ و گُل اور قدرت کے ذخائر سے

مرا سرِ قوم کے افکارِ بہیم نے جھکایا ہے
مرے دل کو مجسّم ایک موجِ خوں بنایا ہے
مجھے خلوت میں اپنے نشّہ سے سرشار رہنے دو
مجھے نظارۂ کونین سے بیزار رہنے دو
میں سب سے دور رہ کر جنگ کا نقشہ جماتا ہوں
نظامِ کار بن جائے تو پھر میداں میں آتا ہوں

میں یہ رستے بدل دونگا نیا جادہ نکالوں گا
خدا چاہے تو زنجیرِ غلامی توڑ ڈالوں گا

دوشیزۂ صحرا

خاموشیٔ فضا کو، رنگینیوں سے بھر دے
جادو بھری نظر سے، دُنیا تباہ کر دے

سحرِ حلال تیری آنکھوں سے بہہ رہا ہے
تیری نوا میں نغمہ راز اپنا کہہ رہا ہے

رنگیں لبوں سے نے میں، ہے سوز و ساز پیدا
ہے زمزموں سے تیرے کیا کیا گداز پیدا

صحرا تری نوا سے بل کھا رہا ہے گویا
ہر ذرّہ سانپ بن کر لہرا رہا ہے گویا

کُہسار سب ہیں ساکت، صحرا سکوت میں ہے
تو نغمہ گر ہے، ساری دُنیا سکوت میں ہے

مردانہ وار لہرے جذبات کے سُنا کر
تابندہ چتونوں سے اک آگ سی لگا کر

خاموشیٔ فضا کو، رنگینیوں سے بھر دے
جادو بھری نظر سے دُنیا تباہ کر دے

شاہی کھنڈر

(سنہ ۱۹۳۶ء)

شاہنشہی کے عہد میں انساں کا ذکر کیا
اُس وقت خشتِ خاک کو حاصل ہوا عروج

مٹی کے ڈھیر بن گئے ایوان ہائے خلد
خود اپنے افتخار سے سرشار تھا عروج

ہر قطرے میں لطافتیں عطر و گلاب کی
ہر ذرّے کے نصیب میں خورشید کا عروج

محرابِ طاق و در پہ ضیا بار رفعتیں
ایوانِ بام و سقف پہ چھوتا ہوا عروج

ماموٗر ہو کے رفعت و عظمت کی شان سے
آنکھیں لڑا رہی تھی زمیں آسمان سے

اے انقلاب اب وہ زمانہ کہاں گیا
کیوں وقت کی زباں پہ ہے افسانۂ زوال

انسان جب گرا تو گرے قصر و بام بھی
یکبارگی چھلک گیا پیمانۂ زوال

ماتم کناں ہیں گوشوں میں بوم و عنکبوت
ایوان ہیں بنے ہوئے غم خانۂ زوال

آثارِ رفتہ کی وہ نگہداشت کیا کرے
انسان خود ہی آج ہے کاشانۂ زوال

شاہی کھنڈر خود اپنے نگہبان آج ہیں
پُر گرد ہیں مگر سرِ ماضی کا تاج ہیں

آ اور اپنے دورِ غلامی کی شان دیکھ
انسان ہے کھنڈر سے زیادہ گرا ہوا

صد گونہ مشکلوں میں ہے ہر وقت مبتلا
ہنگامۂ فنا و بقا میں گھرا ہوا

ایواں یونہی ہیں اپنی جگہ پر ٹلے ہوئے
قلعہ یونہی ہے اپنی جگہ پر کھڑا ہوا

آئینہ آج جلوۂ ماضی و حال ہے
عبرت کا ہے نقاب نظر سے اٹھا ہوا

دامانِ ہست و بود پہ کچھ تو اثر کرے
انسان اک کھنڈر کی طرح ہی بسر کرے

خطرناک سکوت

جب کاروانِ رہ کی بانگِ درا خاموش ہو
جب کاوشِ اندوہ سے ساری فضا خاموش ہو

جب ہر طرف سے قلب پر طاری ہو اک ابر الم
اور عالمِ تخیل کی بزمِ نوا خاموش ہو

جب ساری دنیا اک سکوتِ مستقل آئے نظر
صحرا و بستاں کو پسار و ما سوا خاموش ہو

جب باوجودِ سعی بھی جرأت تکلم کی نہ ہو
جب آشنا بھی صورتِ نا آشنا خاموش ہو

اس وقت رازِ زندگی ناقابلِ ادراک ہے
وہ موت کا اک وقت ہے وہ وقت ہیبت ناک ہے

صبح کا ستارہ

درخشندہ جبیں والے ستارے صبح روشن کے

تری اس لرزشِ پیہم پہ جب میں غور کرتا ہوں
مآلِ خلق پر تیرے اک آہِ سرد بھرتا ہوں

فنا قسمت ہے تو اے ماہ پارے صبح روشن کے
یہ دُنیا جال ہے پھیلے ہیں جس کے ہر طرف پھندے

جو آتا ہے یہاں، بچ کر نکلنا اُس کا مشکل ہے
یہ ہے اک دامِ پنہاں جو ہر اک منزل پہ حائل ہے

تو اپنے کارواں کی گرد بن کر رہ گیا پیچھے
ٹپکتی ہے سپیدی سے ترے چہرے کی حیرانی

تو لرزاں ہو کے دُنیا کی طرف حیرت سے تکتا ہے
مگر اندیشۂ گردش سے تیرا دل دھڑکتا ہے

تجھے بے فائدہ ہے اس کشاکش سے پریشانی
یہ گردش رفتہ رفتہ تیری ہستی بھی مٹا دیگی
کرن سورج کی آتے ہی تجھے درسِ فنا دیگی

ریگستان میں ایک صبح

یہ ریگستان، یہ وقتِ سحر کا دلکشا منظر
تمنّا ہے مری یا رب کہ یہ حالت یونہی رہتی
سرور و فرحت انگیزی کی کیفیّت یونہی رہتی

کبھی ہم آ کے بستے اس فضا میں مطمئن ہو کر
یہ ٹیلے، جو بگولے ہیں کسی کی آہِ سوزاں کے
یہ میداں جن کا وسعت میں نہیں ممکن کوئی ثانی
سوائے اشکِ غربت دُور تک ملتا نہیں پانی

یہ ذرّے ریت کے، یہ سرخ ٹکڑے ماہِ تاباں کے
مجھے وحشی مجھے دیوانہ کر دینے کے ساماں ہیں
یہیں پر زندگی اپنی ضیا میں بھی گزاروں گا
یہیں میں اپنی وحشت کے ہیولوں کو سنواروں گا

مرے دل کے ولولے بھی انھیں ذرّوں میں پنہاں ہیں
فدا ہے صبحِ ریگستاں پہ شامِ زندگی میری
دلِ دیوانہ کہتا ہے کہ منزل ہے یہی میری

بحرِ عرب میں کشتی پر

کس قدر پر لطف یہ منظر ہے شامِ دہر کا

جس طرف دیکھو اٹھا کر آنکھ پانی ہے رواں
دید کے قابل ہیں موجوں کی ترنم ریزیاں

سجدے کرنا دامنِ ساحل پہ ہر اک لہر کا
ہے عجب اک شان پیدا رخصتِ خورشید سے

اپنی کرنوں سے کیا پانی کو اس نے سیم و زر
جس طرح کوئی بچھا دے پھول سطحِ آب پر

دل کے سوتے کھل گئے اس کیفیت کی دید سے
دفعتاً وہ بحر میں اک لہر اٹھی زور سے

دیکھتے ہی دیکھتے اک حشر برپا ہو گیا
کائناتِ آب میں طوفان پیدا ہو گیا

سارا عالم جاگ اٹھا اک صدائے شور سے

یہ مناظر فطرتی کیا دید کے قابل نہیں
بے بصیرت کو مگر ان سے بھی کچھ حاصل نہیں

جمنا کے ساحل پر

مُصفّا آبِ جمنا بہہ رہا ہے کِس روانی سے
نسیمِ صبح سے اس میں ترنّم آشکارا ہے
ہے موسیقی ہوا میں موج کے ہونٹوں میں نغمہ ہے

یہ لہروں نے چرائی ہے ادا کس کی جوانی سے
چلی آتی ہیں کِسن دیویاں اشنان کرنے کو
اسی جوشِ مسرت میں یہ لہریں جوش زن ہونگی
پھر اپنی دُھن میں ساحل کی طرف شعلہ فگن ہونگی

وہ گویا آ رہی ہیں ساز میں اک سُر بھرنے کو
روانی آب کی ملتی ہے شاعر کے تخیّل سے
مسلسل کاروانِ جادۂ فطرت ہے پانی بھی
خرامِ موجۂ ہستی ہے جمنا کی روانی بھی

تلاطم فطرتاً محرم ہے صبر و تحمل سے
نہیں معلوم منزل کونسی اس کی نظر میں ہے
مثالِ دورِ عالم یہ بھی اک پیہم سفر میں ہے

گل و شبنم

گلِ رنگین و شبنم دیکھ کر حیرانیاں کیوں ہیں
یہ فطرت کا پسینہ ہے یہ انجامِ ندامت ہے
یہ پھولوں کے پیالوں میں شرابِ اشکِ حسرت ہے

وگرنہ چشمِ عبرت پر یہ نظّارے گراں کیوں ہیں؟
تجھے دھوکا ہے یہ تارے خوشی کا گیت گاتے ہیں
مری دانست میں ہنستے ہیں انساں کے گناہوں پر
نہیں ہنستے تو روتے ہیں حیا دشمن نگاہوں پر

زمانہ خواب میں ہوتا ہے، یہ آنسو بہاتے ہیں
ہوئی تھی منعقد اک انجمن شب کو گلستاں میں
اِدھر تھیں باغ میں سرگوشیاں انساں کی پستی پر
اُدھر تھی بزمِ فطرت نوحہ خوانِ انجامِ ہستی پر
نہیں شبنم یہ آنسو جذب ہیں پھولوں کے داماں میں

مرا دل اک کنول ہے جس میں تارے رقص کرتے ہیں
محبت چوٹ کرتی ہے تو آنکھوں سے ابھرتے ہیں

بادل

گرمی سے آبِ بحر بھی بن کر دھواں چلا

بھر لیں فضائے دہر سے دامن میں بجلیاں
جس طرح آب و رنگ سے معمور اک جواں

ہل چل ہوئی جہاں میں کہ بادل کہاں چلا
یہ صاعقہ خرام یہ سیّاحِ بحر و بر

رنگینیِ چمن پہ کبھی خندہ زن ہوا
کرنے لگا مآلِ چمن پر کبھی بکا

آیا ہوا کے دوش پہ بے خوف و بے خطر
وہ جس کا سال بھر سے تھا دنیا کو انتظار

ویراں تھا لالہ زار تھیں لب خشک کھیتیاں
کانٹے نکالے بیٹھے تھے سوکھی ہوئی زباں

ہر ذرّہ مرتعش تھا ہر اک قطرہ بے قرار

موجِ نشاط و کیف سے جل تھل بھگو دئے
دامانِ کائنات میں موتی پرو دئے

تفاوت

اِدھر ویران صحرا اور اُدھر پھولوں کی محفل ہے
اِدھر کانٹوں کی نوکیں ہیں اُدھر شاداب کلیاں ہیں
یہ منظر گل بداماں اور وہ آتش بداماں ہیں

انھیں رنگینیوں سے آہ، آلودہ مرا دل ہے
یہ رنگیں محفلیں مجھ کو پیامِ عیش دیتی ہیں
اُبھاریں گی ہمیشہ یہ گنہگاری کے جذبوں کو
ہوائے حرص سے بھڑکائیں گی یہ دل کے شعلوں کو

یہ رنگیں محفلیں اذنِ مدامِ عیش دیتی ہیں
مگر ویران صحرا ہے مرے جذبات کے شایاں
مری وحشت کو کافی ہے بیاباں کی کوئی وسعت
سمجھتا ہوں کہ ہے مانوسِ ویرانی مری فطرت

ہے فطرت کے مناظر میں مری تسکین کا ساماں
ہر اک ویران سبزہ میرے لئے رنگین محفل ہے
جو آسودہ ہو وہ جنگل مرے رہنے کے قابل ہے

پھول

بتا اے پھول، تو کیوں خامش و ناشاد رہتا ہے
ہر انساں گلشنِ ہستی میں ہے تیرا تماشائی
اور اُس کی بزمِ رنگیں میں ہے تیری جلوہ فرمائی

پریشاں کس لئے ہے کس لئے برباد رہتا ہے
محافظ ہیں مقرر تیری خدمت کو گلستاں میں
نسیمِ صبح پیار انداز سے تجھ کو جگاتی ہے
پھر اُس کے بعد شبنم آ کے تیرا مُنہ دُھلاتی ہے

بکھرے رہتے ہیں قطرے مثلِ گوہر تیرے داماں میں
سکوں تجھ کو نہیں حاصل فنا کے کارخانے میں
کبھی شاداب تجھ کو عیش کے ایوان میں دیکھا
کبھی عبرت فزا قبروں پہ گورستان میں دیکھا

غرض تجھ کو نہیں آرام اک لمحہ زمانے میں
یہ ہے قانونِ فطرت خاک تو ہو جائے گا آخر
فنا کر دیگی تیری خاک بھی بادِ صبا آخر

اختتامِ سال پر

گجر بجنا پیامِ الوداعِ سالِ دوراں ہے
اُداسی بن کے حسرت چھائی ہے سارے گلستاں پہ
قمر کی چاندنی پھیکی ہے سطحِ بزمِ امکاں پہ

جو گلشن گل بداماں تھا وہ اب آتش بداماں ہے
ہمیشہ کے لئے اس قافلے سے اب جُدائی ہے
سکوتِ مرگ ہے یا سکوتِ زندگانی ہے
کہ اب ساری فضا پر خامشی کی حکمرانی ہے

گجر کی اک صدائے دور، وجہ شادمانی ہے
گجر، تیری صدائیں کیوں ہیں رنگِ ماتمِ حسرت
بھلا اس مرثیہ خوانی سے اب ہے تجھ کو کیا حاصل
وہ نغمے گا جو ہوں تجدیدِ جوشِ گرمیٔ محفل

ہے ناحق سینہ کوبی اور اظہارِ غمِ فرقت
نئے آثارِ سالِ نو پیامِ شادمانی ہیں
نویدِ کامرانی ہیں، نشاطِ زندگانی ہیں

عصرِ رنگ و بُو

پرواز

فلسفہ ہے زندگی کا آج کل بدلا ہوا
بارشِ عیش و طرب سے ذہن ہی بھیگا ہوا
خشک ہونٹوں کی خشونت مائلِ پرواز ہے
آج میرے ہاتھ میں رنگینیوں کا ساز ہے
موسمی آثار میں ہیں جذب تقصیریں تمام
توڑ ڈالیں حسن نے مستی میں زنجیریں تمام
فرصتِ پرواز ہے تخئیلِ عالم گیر کو
جس طرح کیوپڈ ہوا میں چھوڑ دے اک تیر کو
ہے فضائے بزمِ حسن و عشق سے لبریز آج
آتشِ جذبات ہے حد سے زیادہ تیز آج
بھر دیئے رنگین ساغر وقت نے حسبِ مراد
ہر زباں پر آج ہے "عہدِ جوانی زندہ باد"

عمر میں ایسا بھی اک آتا ہے دورِ خوشگوار
زندگی ہوتی ہی جب انساں کے قدموں پہ نثار
خود برستی ہے شرابِ لالہ فامِ زندگی
اور پی لیتا ہے اس کو تشنہ کامِ زندگی

بادلو، آجاؤ چھا جائیں فضائے مست پر
جلوۂ کیف و مسرت ہو بلند و پست پر
جذبۂ رنگیں فضائے سادہ کو رنگین کر
آج دیدہ مجھ کو دنیا بھر سے عشرت چھین کر

بیخودی جذبوں کو رنگ و چنگ کا پیغام دے
لا مجھے لرزیدہ ہاتھوں سے چھلکتا جام دے

سوچ رکھا ہے کہ سارے میکدوں کو توڑ کر
پُرخمار اک دل بناؤں گا میں شیشے جوڑ کر

صبحِ عشرت زندگی کی ہے مری ہر ایک شام
ہے ضیائے جلوۂ جاوید تاروں کا پیام

ساری دُنیا سے الگ اک کیف میں ڈوبا ہوا
گا رہا ہوں اپنے نغمے آپ ہی بیٹھا ہوا

منزلِ عشرت پہ آ کر رُک گیا ہے کارواں
ان مناظر سے اب آگے ہیں شکستہ وادیاں

چاہتا ہوں ختم ہو جائے مری منزل یہیں
دیں یہیں دنیا یہیں محشر یہیں محفل یہیں

بڑھ سکے اس سے نہ آگے کاروانِ زندگی
ساز اپنا توڑ دے اے نغمہ خوانِ زندگی

زندگی کا مل گیا رنگین تر حاصل مجھے
میری موجیں کھینچ لائی ہیں سرِ ساحل مجھے

صبح حسنِ زندگی، راتیں جمالِ زندگی
میں سمجھتا ہوں یہ ہے حدِ کمالِ زندگی

حدیثِ خودی

سانس اک موجۂ رعنائی ہے
نظر اپنی ہی تماشائی ہے

عشق میرا ہی ہے اک عالمِ شوق
حُسن میری ہی اک انگڑائی ہے

آج میں مسرور ہوں

محفلِ عالم کو جا کر یہ مرا پیغام دو
آج ہیں نظروں میں صبح و شام رنگیں جام دو

جرأتِ نو چاہتا ہے جذبۂ کیف و نشاط
دورِ بادہ سے جواب گردشِ ایام دو

جس کو ہونا ہو شگفتہ آئے میری بزم میں
دو اجازت پھول کو کلیوں کو اذنِ عام دو

نشۂ شوق و تمنا کے اثر سے چور ہوں
آج میں مسرور ہوں ہاں آج میں مسرور ہوں

آ اے تصویر، تو کیوں ہے تصور میں اداس
کیوں ہے پژمردہ ترے اس ہار کے پھولوں کی باس

نذرِ دستِ شوق سے میں نے کیا تجھ کو یہ ہار
تازگی دل کی رہتی یادگار اک تیری پاس

ہو کے غمگیں مضمحل میری مسرت کو نہ کر
تجھ میں ہونا چاہیے میری خوشی کا انعکاس

لے، یہ تازہ پھول، کیوں افسردہ و دلگیر ہے
یہ ترے مستقبلِ رنگیں کی اک تصویر ہے

پہلا پیار

(زندگی کی ایک رومان آفریں رات میں)

کنول کا رنگ، کلی کا نکھار تیرے لئے
ترے لئے ہے گلستاں، بہار تیرے لئے

شفق میں عکس ہے تیرے لبِ نگاریں کا
اُفق پہ جلوۂ برق و شرار تیرے لئے

ترا جمال ہے بزمِ حیات کی زینت
ہر آبشار، ہر اک لالہ زار تیرے لئے

کنارِ گل میں ترے سونگھنے کو بوئے شمیم
صبا کی گود میں پھولوں کا ہار تیرے لئے

بلندیوں پہ ترا نورِ صورتِ مہِ نو
ہے کائنات ضیا در کنار تیرے لئے

یہ تیری عصمت و عفت یہ تیرا حسن و جمال
شباب پر ہے ترا روزگار تیرے لئے

سہاگ تیری لطافت کے نام سے معنون
دوشیزگی کا اچھوتا نکھار تیرے لئے

یہ لمحہ حاصلِ جذباتِ زندگانی ہے
جسے میں سوچ رہا تھا تو وہ کہانی ہے

کمالِ بے خودیٔ شوق سے خراب ہوں میں
اگرچہ اپنی نظر میں خود آفتاب ہوں میں

تو اپنی مست نگاہوں میں جذب کر مجھ کو
ترے لبوں کی جو تشنہ ہے وہ شراب ہوں میں

ضیائے ماہ ہے جس طرح جلوۂ خورشید
جو تو امنگ ہے میری ترا شباب ہوں میں

تری جبیں پہ ادا کیف کے کروں سجدے | کہ آج اپنی اُمنگوں میں کامیاب ہوں میں
شمیمِ زلف سنگھا دی کہ نیند آ جائے | ہوئی ہے عمر کہ ناآشنائے خواب ہوں میں
یہ تیرے عارضِ رنگین یہ چاندنی راتیں | سکوں نصیبِ تجلّیِ ماہتاب ہوں میں
ذرا نوازشِ مضراب شوق ہونے دے | جہانِ نغمہ میں سر گشتۂ رباب ہوں میں

یہ پہلا پیار جو تقدیس ہے مسرّت کی
بیاضِ حسن پہ اک مُہر ہے محبّت کی

آہ یہ راتیں!

پھر وہی رُت، پھر وہی برسات ہے | کیف میں بھیگی ہوئی ہر رات ہے
پھر وہی بوندوں کے پیالوں میں شراب | آبروئے عالمِ جذبات ہے
پھر ہیں راتیں پُر ضیا انوار سے | پھر وہی جوشِ تجلّیات ہے
سچ کہا تھا کہنے والے نے ضیاؔ | "اپنے اپنے وقت سے ہر بات ہے"

خلوتِ تاریک بزمِ طور ہے
آج میرا دل بہت مسرور ہے

وصال

یہ کالی کالی دوشیزہ گھٹائیں چھا نہیں سکتیں یہ کلیاں ہار کی کھِل کھِل کے یوں مُرجھا نہیں سکتیں
یہ کرنیں پھر مِری آغوش کو چمکا نہیں سکتیں یہ عشرت کی بہاریں لوٹ کر پھر آ نہیں سکتیں
مرے دل میں مگر مستی رہے گی بادہ باران کی

خدائی کے لئے اک رحمت معلوم ہیں دونوں زوال و نقص کے الزام سے محروم ہیں دونوں
ضیائے صبح جنت کی طرح معصوم ہیں دونوں جوانی اور محبت لازم و ملزوم ہیں دونوں
خزاں کی زحمتوں سے ناشنا سا ہے بہاران کی

نشاطِ اوّلیں کی سب ادائیں غیر فانی ہیں یہ سب عنایاں کیفِ سرورِ نوجوانی ہیں
یہ رنگیں ساعتیں جو آج وجہ کامرانی ہیں مسرت کی یہ گھڑیاں جو نوید شادمانی ہیں
ضیا اُمید کے دم سے ہے باقی یادگاران کی

⁂

نیرنگِ خیال

نگاہوں میں بجلی سی چمکا رہا ہے
خیالوں میں شعلے سے برسا رہا ہے
تصوّر میں جلووں کو لہرا رہا ہے
کشش سے مرے دل کو لرزا رہا ہے
نہ معلوم کون آج یاد آرہا ہے؟

جبیں سے ہے پیدا نئی بے قراری
لبوں پر ہے رنگینیٔ رازداری
کنائے کنائے میں ہے غمگساری
اشاروں اشاروں میں سمجھا رہا ہے
نہ معلوم کون آج یاد آرہا ہے؟

عجب رنگ پیدا ہے کالی گھٹا سے
نواؤں کی خوشبو عیاں ہے ہوا سے
مرا شعرِ غم اپنی رنگیں صدا سے
کسی انجمن میں کوئی گا رہا ہے
نہ معلوم کون آج یاد آ رہا ہے؟

فراموش دل سے کسے کر رہا ہوں
مآلِ غمِ عشق سے ڈر رہا ہوں
خیالوں کو تسکین سے بھر رہا ہوں
کوئی کیوں پریشاں کئے جا رہا ہے
نہ معلوم کون آج یاد آ رہا ہے؟

کبھی میں تصور میں چھوتا ہوں زلفیں
کبھی چومتا ہوں نشیلی نگاہیں
کبھی اُس کو محسوس کرتا ہوں دل میں

غرض مجھ پہ ہر سمت سے چھا رہا ہے
نہ معلوم کون آج یاد آ رہا ہے؟

بہت ملتفت ہیں فسوں خیز آنکھیں
ہیں بادہ صلح خوں ریز آنکھیں
ہیں میری ہی جانب دل آویز آنکھیں
مری ہی طرف ہاتھ پھیلا رہا ہے
نہ معلوم کون آج یاد آ رہا ہے؟

دکھاتا ہے گرمیٔ آغوش مجھ کو
سناتا ہے افسانہ دوش مجھ کو
مگر دیکھ کر پھر بھی خاموش مجھ کو
ہنسے جا رہا ہے ہنسے جا رہا ہے
نہ معلوم کون آج یاد آ رہا ہے؟

ربابِ شباب

اُفق پہ شمعیں جلا رہا ہوں شفق کی موجیں بڑھا رہا ہوں
نشاط کے گیت گا رہا ہوں تمام عالم پہ چھا رہا ہوں
نئے فسانے بنا رہا ہوں نئے ترانے سنا رہا ہوں
جمال میں مسکرا رہا ہوں خیال میں لہلہا رہا ہوں

چمن چمن جلوہ گاہ میری بہار کے سر پہ تاج میرا
میں ایک ترکیبِ رنگ و بو ہوں بہت ہے رنگیں مزاج میرا

میں برق بھی ہوں شرار بھی ہوں میں بادلوں کی پھوار بھی ہوں
میں عظمتِ کوہسار بھی ہوں میں نزہتِ لالہ زار بھی ہوں
میں کیف بھی ہوں خمار بھی ہوں شگفتہ پھولوں کا ہار بھی ہوں
میں شامِ ضَو در کنار بھی ہوں میں صبحِ فصلِ بہار بھی ہوں

مرے اشاروں پہ انجمن میں یہ دَورِ عشرت کا چل رہا ہے
کنول ہو یا میکدے کا ساغر ہر ایک سانچے میں ڈھل رہا ہے

کبھی رجز خواں میں جنگ میں ہوں کبھی رباب اور چنگ میں ہوں
کبھی شررِ قلبِ سنگ میں ہوں کبھی فروزاں تپنگ میں ہوں
کبھی خوشی کی اُمنگ میں ہوں کبھی مسرت کے رنگ میں ہوں
میں جوش میں ہوں ترنگ میں ہوں میں تیر میں ہوں تفنگ میں ہوں

جمال میں سادگی کے پنہاں ہر ایک جلوہ جوان میرا
کمانِ کیوپڈ کی ہر کشش سے ابھر رہا ہے اُٹھان میرا

مجھی سے تہذیبِ بے خودی ہے مجھی سے تکمیلِ سر خوشی ہے
مجھی سے یہ کیفِ زندگی ہے مجھی سے پُر نور چاندنی ہے
مجھی سے توقیر حُسن کی ہے مجھی سے توقیرِ عاشقی ہے
یہ میرے جلووں کی روشنی ہے کہ آج دُنیا نئی نئی ہے

حسین نغمے الاپتا ہوں کبھی میں خاموش وادیوں میں
کبھی میں پھولوں سے کھیلتا ہوں بہار کی شاہزادیوں میں

نفس نفس کو شراب کر دے چمن چمن کو خراب کر دے
نگاہ کو آفتاب کر دے جہاں کو پُر التہاب کر دے
نوا کو صرفِ رباب کر دے تسلّیٔ اضطراب کر دے

نشاط کو کامیاب کر دے　　　اک اور پیدا شباب کر دے

تجھے قسم ہے کچھ اس طرح انحطاط میں ہو شباب پیدا
کہ بزمِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہو نیا انقلاب پیدا

یہ شانِ عظمت یہ رنگِ تمکیں　　　یہ دورِ رعنا یہ عہدِ رنگیں
ہے جس کا ہر لمحہ ایک تسکیں　　　ہے جس کی ہر اک ادا نگاریں
یہ صبحِ پُر جلوہ اور شیریں　　　یہ شام مخمور اور مشکیں
یہ محفلِ نسترن و نسریں　　　یہ بزمِ رخشانِ ماہ و پرویں

جو کام کرنا ہے آج کر لے یہ وقت ہرگز نہ پائیگا پھر
کہ عمرِ فانی کا یہ زمانہ گیا تو واپس نہ آئے گا پھر

یہ شب کی تاریکیاں مٹا دو　　　جو سو رہے ہیں انھیں جگا دو
فسردہ شمعوں کی لَو بڑھا دو　　　سوادِ عالم کو جگمگا دو
حجابِ افسردگی اُٹھا دو　　　بہار کی پھر جھلک دکھا دو
جو غم زدہ ہیں انھیں صدا دو　　　کہ پھول بن جاؤ مسکرا دو

نشاط کے ساتھ زندگی بھی سدا ہو عظمتوں سے میری
جو زندۂ جاوداں بنا دے وہ کام لو قوتوں سے میری

پریم کی آگ

وہ دل میں پریم کی اک آگ سی لگا دینا
حواس و ہوش کو سوز آشنا بنا دینا

وہ اضطراب میں پیہم تسلّیاں دے کر
تھپک تھپک کے سرِ شام ہی سُلا دینا

وہ میری تاروں کی محفل وہ چاندنی راتیں
نگاہِ تشنہ سے وہ حُسن کو دُعا دینا

نہاں نہاں وہ جنوں کا اثر لئے پھرنا
وفورِ غم میں جو نالہ اُٹھے دبا دینا

کسی کی یاد بھُلانے کی کوششیں کرنا
جو اُبھرے نقشِ تصوّر اُسے مِٹا دینا

اُس اپنے عہد کو اب یاد کر رہا ہوں میں

بھڑک کے شعلۂ اُلفت مجھے فنا کر دے
خرابِ موج ہوں ساحل سے آشنا کر دے

میں جستجوئے سکوں میں رہا ہوں سرگرداں
یہی ہے تجھ سے گزارش سکوں عطا کر دے

سُلگ رہی ہے محبت کی آگ سینے میں
جو ہو سکے تو مرے درد کو دوا کر دے

نئی فضائیں ہوں میری حیات کی تعمیر
قیودِ عیش و الم سے مجھے رہا کر دے

بساطِ عشق پہ ہوں تشنۂ سکوں کب تک؟
یہ ابتدا ہے تو جلد اس کی انتہا کر دے

تجھی سے اب تری فریاد کر رہا ہوں میں

نگاہ کو ہوسِ سیرِ لالہ زار نہیں
شرابِ ناب کا سر میں مرے خمار نہیں

سکون سے مجھے خلوت میں بیٹھ جانے دو
ہوائے بزمِ جہاں مجھ کو سازگار نہیں

نشاطِ لالہ و گل کو مری دعا پہونچے
بہ ایں پیام، کہ میں تشنۂ بہار نہیں

میں اور ایک مسلسل فسانۂ غمِ دوست
مجھے اب اور کسی غم کا انتظار نہیں

سجی ہوئی ہے محبت سے زندگی میری
یہ موجِ گل مرے سینے میں ہے شرار نہیں

اس آگ سے یہ گھر آباد کر رہا ہوں میں

وہ فرصت کے رات دن!

پھر چاہتا ہے دل کہ تماشا کرے کوئی
پردہ اُٹھا کے عزمِ تجلا کرے کوئی

پھر چاہتا ہے دل کہ سناؤں نئی داستاں
منّت سے بار بار تقاضا کرے کوئی

پھر چاہتا ہے دل کہ ہوں ہم رنگ حسن و عشق
میرے ہی دل سے میری تمنا کرے کوئی

پھر چاہتا ہے دل کہ بہاؤں میں اشکِ غم
آزردگی مری نہ گوارا کرے کوئی

لیکن کہاں نصیب وہ فرصت کے رات دن
اے انقلابِ دہر ترا کیا کرے کوئی

حسن کا پیغام

فطرت کے نام

تونے اے فطرت مجھے بخشا کمالِ زندگی
بے طلب دے دی متاعِ لازوالِ زندگی

گلشن و صحرا میں پھیلا دی مری اک داستان
درسِ غور و فکر ہے میرے لئے سارا جہاں

سیر کرنے ساحلِ دریا پہ جب جاتا ہوں میں
مضطرب اپنے لئے ہر موج کو پاتا ہوں میں

جلوہ گاہِ صبح سے ہوتا ہے کوئی ہمکلام
رات کو تاروں میں دیتا ہے کوئی چھپ کر پیام

جستجو میں عشق کی، میں مدتوں پھرتا رہا
ایک در کی آرزو میں دربدر بھٹکا کیا

وقف کر دی تونے خاطر سے مری اک بارگاہ
عشق کی آغوش میں لی میری فطرت نے پناہ

خالقِ فطرت، مجھے سرمایۂ تسکیں بھی دے
بہرِ تنظیمِ محبت اک نیا آئین بھی دے

عشق کی فطرت سے فطرت کو مری مانوس کر
میری نظروں سے علاجِ خاطرِ مایوس کر

میری فطرت کو بدل، اے کارسازِ حسن و عشق
ورنہ دنیا سے مٹا دے امتیازِ حسن و عشق

(۱۹۳۳ء)

شاعر:-

اے کمانِ دارِ محبت اے شرارِ دل فروز
اے کہ تیری ہر نظر اک شمع ہے محفل فروز

تیرے تیروں سے جبینِ حُسن پر سو داغ تھے
تیرے ترکش کی ہدف تھی لیلیٔ محمل فروز

ٹوٹتا تھا اک اشارے سے ترے اُس کا طلسم
وہم کی دنیا جو تھی حق پوش اور باطل فروز

روشنی دی تیری کرنوں نے سوادِ شام کو
ہو گیا تیری عنایت سے کسی قابل فروز

تھیں ثریا کے تبسم میں تمہی رعنائیاں
کسب کرتا تھا تری ضو سے مہ کامل فروز

رہنمائے کعبۂ مقصود تھی تیری نگاہ
ایک انگڑائی تھی تیری جادۂ منزل فروز

دل ترے قابو میں تھے اور دل میں تھیں تابانیاں
روح تیری بس میں تھی اور روح کا حاصل فروز

تیری اک ہلکی سی جنبش نے کیا آساں اسے
جو مصیبت عالمِ جاں میں ہوئی مشکل فروز

تیری نظروں سے تلاطم بحر کی موجوں میں تھا
تو اندھیری رات میں اک شمع تھا ساحل فروز

شورشوں سے تیری رونق عشق کی محفل میں تھی

تو نہیں تھا اور تیری آگ سب کے دل میں تھی

اب اگر کچھ سرد سی ہے گرمیٔ بازارِ عشق　　عرصۂ ہستی میں گویا بند ہے پیکارِ عشق

ظلمتیں مایوسیوں کی دل پہ ہیں چھائی ہوئی　　ڈوبتے تاروں میں ہیں ڈوبے ہوئے انوارِ عشق

اب مسلط ہیں نگاہِ عشق پر لاکھوں حجاب　　اب کسی سینے سے پیدا ہی نہیں اسرارِ عشق

کیا خبر تھی ایک دن آئے گا ایسا انقلاب　　آہ کیا معلوم تھا بدلیں گے یوں آثارِ عشق

حسنِ عشوہ کار کی نذریں نہیں ہوتیں قبول　　منعقد ہوتا نہیں شاید کہیں دربارِ عشق

ہے مذاقِ غزنوی باقی نہ وہ ذوقِ ایاز　　عشق کی فطرت نظر آتی ہے خود بیزارِ عشق

اب درائے کارواں سے وادیاں خاموش ہیں　　اب نہیں پیوست پائے راہرو میں خارِ عشق

اب کہاں وہ شورشِ بزمِ خودی و بیخودی　　زنگ خوردہ ہے سناں خالی پڑی ہے دارِ عشق

کردیے مسمار قلعے جس نے روم و مصر کے　　وہ ترا لشکر کہاں ہے اے سپہ سالارِ عشق

چھن گیا فطرت سے کیا وہ رتبۂ عالی ترا؟
آہ کیا تیروں سے ترکش ہو گیا خالی ترا!

کیوپڈ:-

مجھ کو فطرت نے بنایا پاسبانِ زندگی　　میرے قدموں میں بچھایا گلستانِ زندگی

ہر نفس سے میرے جاگا، عالمِ خوابِ زمیں — ہر نظر سے میری لرزا آسمانِ زندگی

نصب میں نے اس کے خیمے تا بہ منزل کر دیے — جب چلا میرے قدم پر کاروانِ زندگی

حُسن سے سجدے کرائے میں نے پائے عشق پر — عشق کو میں نے بنایا رازدانِ زندگی

وادیوں میں لعنِ صحرا پر پڑھی میں نے نماز — ہر کھنڈر میں جا کے میں نے دی اذانِ زندگی

بلبلِ بیتاب کو میں نے دیا درسِ فغاں — باغ میں گُل کو بنایا نغمہ خوانِ زندگی

تا نہ صیادِ ہوس کی اس کو نظریں چھو سکیں — دوشِ گردوں پر سجایا آشیانِ زندگی

ہاں ملا راتوں کو نورِ کیف میرے سوز سے — ہاں مرے نالوں سے گونجا شبستانِ زندگی

بیستون و نجد میں برسوں اُڑا رایت مرا — جمع جس کے سائے میں تھا اک جہانِ زندگی

یوں مرتب زندگی اک جاودانی میں نے کی

عالمِ حسن و وفا پر حکمرانی میں نے کی

میرے ہی جلووں سے کل معمور تھا بازارِ حُسن — میرے گھر کا دوسرا اک نام تھا سرکارِ حُسن

تھا مسیحائی پہ اپنی جن کو زعم بے حساب — کر دیا ان کو بھی میرے تیر نے بیمارِ حُسن

مصر اور یونان میں قائم کیے میں نے محاذ — عرصہ گاہِ عشق میں برپا ہوئی پیکارِ حُسن

منکرانِ عشق کو چو رنگ میں نے کر دیا — خون اُس کا پی لیا جس نے کیا انکارِ حُسن

میں نے قوموں کے دلوں میں پھونک دی غیرت کی آگ — چھا گئی افراد پر رخشانی آثارِ حُسن

شام کو میں نے سجائی زلفِ رنگینِ شفق
صبح کو میں نے سنوارا مطلعِ انوارِ حسن

میں نے کی جنسِ وفا ارزاں بساطِ دہر پہ
میرے ناخن سے کھلا ہر عقدۂ دشوارِ حسن

مشرق و مغرب میں میخانے نئے قائم کئے
کر دیا پھر اُن پہ طاری جذبۂ سرشارِ حسن

حسن کا میں نے مٹا ڈالا غرور و کبر و ناز
عشق کے دل کو کیا میں نے امانت دارِ حسن

دہر میں بعدِ خدا فرماں روائی تھی مری
روح کی قوت سے دُنیا میں خدائی تھی مری

عالمِ فانی میں آیا دفعتہً انقلاب
نوحۂ ماتم سے بدلا نغمۂ چنگ و رباب

ابر بن کر دہر پر لعنت ہوس کی چھا گئی
حسن اب ناکام تھا اور عشق تھا ناکامیاب

خود غرض قوموں نے اپنی حق پرستی چھوڑ دی
ذہن پر چھڑکی گئی مینائے باطل سے شراب

مادی رستے بنائے قافلوں نے ہر طرف
ہو گیا یوں جادۂ روحانیت کا سدِ باب

حُسن کی آنکھوں میں اک خوابِ تغافل بھر گیا
عشق کا دل ہو گیا اس شغلِ بےجا سے خراب

میں نے ترکش پر نظر ڈالی تو وہ خالی ملا
سرد ہو کر رہ گیا میری نظر کا التہاب

اب کھڑا ہوں میں بخود خاموش اور حیرت زدہ
جیسے ڈھل کر رہ گیا ہو اک دوشیزہ کا شباب

سائکی کی قہرمانی ہر ادا روٹھی ہوئی
ہر نظر زہرہ کی ہیبت آفرین و پُر عتاب

لوٹ لی اہلِ ہوس نے آہ وہ دُنیا مری
حرص و پندار و خودی کے ڈال کر لاکھوں حجاب

تیر و پیکاں کے تصوّر سے بھی تھراتا ہوں میں
اب ہوس کے تیر اپنے دل پہ خود کھاتا ہوں میں

دیکھ وہ اک نوجواں مستِ بہارِ آرزو
جس کی نظروں سے عیاں ہے اضطرارِ آرزو

تھا محبت ہی محبت پہلے اس کا ہر نفس
اب یہ ہے تخریب کے ہاتھوں شکارِ آرزو

عشقِ صادق پہلے اسکی روح میں بیدار تھا
اب شبِ تاریک ہے اور خوابِ تارِ آرزو

عشق کے جذبوں سے پہلے تھا مقدّس اسکا دل
اب اسے کہتی ہے دُنیا جرم کارِ آرزو

پہلے نازش تھی اسے سرگرمئ جذبات پہ
اب یہ ہے ردِّ عمل سے شرمسارِ آرزو

یہ سبک سیرِ فضا تھا پہلے خلدِ عشق میں
اب ہیں اس کے پاؤں وقفِ خارزارِ آرزو

آرزو کی اس کے ہاتھوں ہوگئی مٹّی خراب
کھو دیا اس کے تلوّن نے وقارِ آرزو

اب ہوس کی چھا رہی ہیں قلب پر تاریکیاں
پہلے اس کے دل میں روشن تھا شرارِ آرزو

دور دور آتی نہیں پہلی سی وہ رونق نظر
منتشر ہے آج اس کا کاروبارِ آرزو

تیر میرے کُند ہیں ترکش مرا بیکار ہے
اب مجھے خود تیر اندازی سے اپنی عار ہے

اب بھی اک ہستی فروغِ عالمِ ایجاد ہے
اب بھی اک دل زندگی کی آگ سے آباد ہے

اب بھی ہیں اک روح میں اسرار کی چنگاریاں
اب بھی اک سینہ فساد و حرص سے آزاد ہے

اب بھی اک انساں مقدس ہے فرشتے کی طرح
ایک قدسی اب بھی شایانِ مبارکباد ہے

اب بھی اس کے دل میں ہیں جذباتِ علوی موجزن
درد سے انسانیت کے آج بھی برباد ہے

وہ تری ہستی ہے اے شاعر، وہ پیکر ہے ترا
واقفِ رازِ غمِ عالم ہے اور ناشاد ہے

جانتا ہوں تو نے دُنیا کو جگایا خواب سے
گونج اُٹھی تیری صدا تاروں میں مجھ کو یاد ہے

وہ امانت آج میں تفویض کرتا ہوں تجھے
دل مرا جس کی تپش سے مائلِ فریاد ہے

محرمِ کاشانۂ الہام ہے تیری صدا
قوتوں پر روح کی قائم تری بنیاد ہے

کام جو مجھ سے نہیں ممکن، اُسے انجام دے
جاگ اے شاعر کہ دُنیا خستۂ بیداد ہے

تیرے قبضے میں سلاحِ دو جہاں دیتا ہوں میں
لے تجھے یہ تیر، ترکش اور کماں دیتا ہوں میں

مری حیات کو وسعت دی ہے تو نے کریم
مگر خیال کی وسعت کہ ہو رہی ہے تنگ

بجا کہ علم سے تو نے سخن بحال کیا
مگر یہ کیا کہ ہوا علم خوفناک نہنگ

وصالِ نگاہ مرکزِ نور میں

چاندنی راتوں میں فطرت کی نظر آرائیاں
حُسن بھی بیدار ہے، جاگا ہوا جلوا بھی ہے

نور کے مرکز میں تیری روح ہو جائے جذب
اے دلِ بیتاب یہ منظر کبھی دیکھا بھی ہے؟

تیری فطرت میں ہے کیا جذب و کشش اے ماہتاب
شعلۂ ایمن تری آغوش میں صحرا بھی ہے

اپنی منزل تک پہونچ جانے کو ہے بے تاب تو
اے سکوں نا آشنا کیا تجھ کو یہ سودا بھی ہے؟

کس کی عالم تاب کرنیں تجھ میں آ کر رک گئیں
کیا بتاؤں میں نے کیا دیکھا کہ نظریں جھک گئیں

ہو رہا ہے بیخودی میں دو نگاہوں کا وصال
کارفرما ہے تخیّل مرکزِ مہتاب میں

جس طرح دو پھول اڑ کر ایک جا ہو جائیں جمع
بہتے بہتے دو کنول جیسے رکیں تالاب میں

میرا اعجازِ تصوّر دیکھنے کی چیز ہے
جیسے بیٹھا ہوں کسی پُر نور بزمِ خواب میں

ڈال لے اے چاند رخ پر ابر کا گہرا نقاب
ہوک سی اٹھنے لگی میرے دلِ بے تاب میں

اس ترے کافر نظارے میں سکونِ دل نہیں
یہ تری تابانیاں برداشت کے قابل نہیں

دل کی پیاس

چمنِ دہر میں مجروحِ تماشا ہوں میں — خار بن کر رگِ ہر گُل میں کھٹکتا ہوں میں

سیرِ گلشن سے اُلجھتی ہے طبیعت میری — دشت و کہسار میں تسکین کا جویا ہوں میں

ہے کبھی چاند کی کرنوں میں مسرّت کی تلاش — موجِ دریا سے کبھی سائلِ صہبا ہوں میں

کبھی محسوس محبّت میں سکوں کرتا ہوں — اور کبھی حُسن کو پُر کیف سمجھتا ہوں میں

کبھی ہے گوشہ نشینی میں قرارِ خاطر — کبھی آوارہ ہنگامۂ دُنیا ہوں میں

صبح کو چین نہیں رات کو آرام نہیں
آہ یہ زیست کہ آسودۂ ایام نہیں

اے مُغنّی کوئی نغمہ ہی سُنا دے مجھ کو — مطلقاً بے خودِ احساس بنا دے مجھ کو

خیر ساقی تری ان کیف بھری آنکھوں کی — جو کسی کو نہ پلائی، وہ پلا دے مجھ کو

مہِ نو آ ترے جلووں میں سما جاؤں میں — آسماں کے کسی گوشے میں چھپا دے مجھ کو

اے محبّت مجھے دے گرمیٔ پہلو میں پناہ — کہیں ایسا نہ ہو یہ درد مٹا دے مجھ کو

اے نسیمِ چمنِ حُسن اگر ممکن ہو — دل کی آسودگیاں ڈھونڈ کے لا دے مجھ کو

تپشِ غم کے تواتر سے پُھکا جاتا ہوں
شدّتِ گرمیٔ فطرت سے جلا جاتا ہوں

گذارش

اے ہمدمِ دیرینہ، اے واقفِ رازِ دل — روکے سے نہیں رکتا اب سوز و گدازِ دل

ہے زینتِ دل جب سے جذباتِ نوازِ دل — معمور ہے شیون سے ہر پردۂ سازِ دل

یہ جوشِ محبت ہے

ہنگامۂ الفت ہے

الفت مجھے راحت ہے

اور غم مری فطرت ہے

اک لذتِ بے پایاں میں قلب میں پاتا ہوں — اشکوں سے لگی دل کی خلوت میں بجھاتا ہوں

یہ وقت غنیمت ہے

کھل کر مجھے رونے دے

ہے صبح و مسا برپا طوفان مرے دل میں — اٹھتا ہے محبت کا ہیجان مرے دل میں

میں کیا کہوں کیا کیا ہیں ارمان مرے دل میں — اک ہوک سی اٹھتی ہے ہر آن مرے دل میں

دل نعل در آتش ہے

بھڑکی ہوئی سوزش ہے
اُلفت کی نوازش ہے
یا حُسن کی سازش ہے

مانا کہ مرا رونا توہینِ محبت ہے مانا کہ مجھے ضبطِ گریہ کی ضرورت ہے
لیکن یہ گذارش ہے
کھُل کر مجھے رونے دے!

رونے سے مرے دل کا ہیجان تو کم ہوگا رونے سے تکدر کا سامان تو کم ہوگا
رونے سے نہ رونے کا ارمان تو کم ہوگا رونے سے تمنا کا طوفان تو کم ہوگا

ہے حُسن جفا فطرت
کیا مجھ کو ملے راحت
ہر وقت ہے اک کلفت
ہر لحظہ ہے اک وحشت

کرنے دے محبت کی دیوی پہ نثار آنسو خلوت میں بہانے دے ہمدم مجھے چار آنسو
پھر ہو کہ نہ ہو فرصت
کھُل کر مجھے رونے دے

ایک حسین رات کے تصوّر میں

کہیں وہ بزمِ طرب میں اپنی خوشی کی شمعیں جلا رہے ہیں
کچھ ایسی کیفیتیں ہیں طاری کہ آئینے مُسکرا رہے ہیں

وہ کثرتِ تابش و ضیا ہے کہ بزم بجلی بنی ہوئی ہے
قمر بھی پھیکا پڑا ہوا ہے ستارے بھی جھلملا رہے ہیں

تجلیاں سی برس رہی ہیں زمیں پہ ہے آسماں کا دھوکا
نگاہِ دزدیدہ سے وہ محفل میں چاند تارے بنا رہے ہیں

نیاز اور التفات میں ناز کی متانت بدل گئی ہے
کسی کو ہنس کر بُلا رہے ہیں کسی کو اُٹھ کر بٹھا رہے ہیں

یہ چاہتے ہیں کہ ساری دُنیا کو آج کیف و نوا سے بھر دیں
کبھی وہ بربط سے کھیلتے ہیں کبھی رباب آزما رہے ہیں

سب اپنے کاموں میں مستعد ہیں وہ دستِ نازک وہ مست آنکھیں
کسی کو پینے کا ہے اشارہ کسی کو خود ہی پلا رہے ہیں

عجب مسرّت، عجب عالم، وہ خود ہی مطرب ہیں خود ہی ساقی
کہ شیشہ و ساغر و سبو سب نشاط کے گیت گا رہے ہیں

وہ رنگِ محفل وہ چنگِ محفل وہ شانِ محفل وہ جانِ محفل
نظر نظر میں بسے ہوئے ہیں نظر نظر میں سما رہے ہیں

کچھ اُن کے جلوے ہیں نور افزا کچھ ان کی باتیں سحر افزا
ہے بارشِ رنگ و نور ایسی کہ ہار تک جگمگا رہے ہیں

نہ سوزِ پروانہ کی خبر کچھ نہ شمع کے ساز کا اثر کچھ
وہ اپنے نغموں کی مستیوں سے تمام محفل پہ چھا رہے ہیں

تمام محفل پہ چھا رہے ہیں، ہے جذب اُن میں تمام محفل
نظر کسی کی طرف نہیں ہے مگر دلوں کو لبھا رہے ہیں

جمال یہ ہے کہ اہلِ محفل کے دل نہیں پہلوؤں میں قائم
کمال یہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے ہزاروں فتنے اُٹھا رہے ہیں

چمن چمن لہلہا رہی ہے دلوں میں بوئے شباب اُن کی
وہ عطر میں خود بسے ہوئے ہیں تو روح کو بھی بسا رہے ہیں

یہ معجزہ ہے ہر ایک دل کہہ رہا ہے محسوس اُن کا جلوہ
یہ واقعہ ہے کہ وہ دلوں میں نہ آ رہے ہیں نہ جا رہے ہیں

بجا کہ ہے اُن کی انجمن صد نشاط و صد کیف و صد گلستاں
مگر ضیاؔ کس طرح سمجھ لیں کہ ہم اُنھیں یاد آ رہے ہیں

شہسوار

سمندِ برق پر ضیاؔ وہ بجلیاں رواں ہوئیں
تجلّیاں لباسِ رنگ و بُو میں ضو فشاں ہوئیں

یہ اک حسین اکبہ کی تمکنت کے ہیں نشاں
کہ جیسے بجلیاں ہوں رہگزار سوئے آسماں

یہ رنگِ بے خودی ترا یہ آن و شانِ دلبری
دلبریوں کے رنگ میں تمہی ادائے کافری

نظر میں تیری رفعتیں دلوں پہ حکمرانیاں
یہ تیری جست جست میں خموش لن ترانیاں

یہ تیری دلربائیاں متاعِ باغِ زندگی
یہ تیری تیز دستیاں مئے ایاغِ زندگی

بھڑک اُٹھی ہے بزمِ ناز ربطِ ساز و سوز سے
تو فتح کر جہان کو جمالِ دلفروز سے

شجاعتیں دکھا کے پھر سپہ گری کا درس دے
جہانِ دل شکستہ کو دلاوری کا درس دے

دعوتِ رنگ و بو

مجھ سے کل اک دوست نے ہنس کر یہ فرمایا ضیاؔ
اپنے باغِ عمر سے لازم ہے گلچینی تجھے

جلوہ آرا حسن کو بامِ ہوس پر دیکھ کر
کیوں نہیں ہوتا کبھی احساسِ رنگینی تجھے

عشرتِ نظارہ ہے آئینہ رخساروں کی دید
ترک کرنا چاہئے آئینِ خود بینی تجھے

حسن کے حملوں کا خوگر تجھ کو ہونا چاہئے
تا نہ ہو مشکل شکستِ غنچہ آئینی تجھے

ہر نفس عیش و مسرت سے بہار انگیز ہو
حسن کی رنگینیوں سے زندگی لبریز ہو

مسکرا کر ہو گیا خاموش، اس دعوت پہ میں
فطرتاً تردید و حجت کی مجھے عادت نہیں

کاش میرے ہم نشیں پر منکشف ہوتا یہ راز
عارضی جلووں میں کھو جانا مری فطرت نہیں

اک حریمِ گل ہے مجھ کو، صد گلستاں صد بہار
تیتری کی طرح ہرجائی مری طینت نہیں

جانتا ہوں میں سرورِ باطلِ حرص و ہوا
یہ ہوس کاری فریبِ نفس ہے عشرت نہیں

ظرف پیدائی ضروری ہے جہانِ کیف میں
ظرف ہوگا تو شرابِ شوق کی قلت نہیں

خود نکل آتی ہیں راہیں ذوق میں تقسیم کی
درسِ فطرت کے لئے، حاجت نہیں تعلیم کی

میں مصروفِ محبّت ہوں

فرصتِ عیش ہے یک لمحہ سرِ شام مجھے
مِل گیا ہو مئے بے کسل سے اک جام مجھے

اپنی آغوشِ محبت میں چھپا لے اے دوست
کہیں کر دے نہ کرن چاند کی بدنام مجھے

عرش تک وسعتِ خلوت کو فروزاں کر دو
موجبِ ننگ ہے یہ قیدِ در و بام مجھے

شدتِ کیف سے اک نیند سی آ جاتی ہے
پہلوئے حسن میں ملتا ہے جب آرام مجھے

مجھ میں اور تجھ میں کوئی فاصلہ باقی نہ رہا
روح دیتی ہے صدا، لے کے ترا نام مجھے

جو گزرنی ہے مرے جی پہ گزر جائے یہیں
کاش رفتارِ زمانے کی ٹھہر جائے یہیں

یہ ترا عشوہ یہ دزدیدہ نگاہی توبہ
یہ تری زلف کی مستانہ سیاہی توبہ

یہ ترے حسن کی تمکین یہ ترا نازِ وقار
ترے انداز میں یہ سطوتِ شاہی توبہ

تری ہونٹوں پہ یہ میخانۂ ہستی لرزاں
انکھڑیوں کی یہ تری بادہ پناہی توبہ

یہ مری روح پہ پُر کیف تسلط تیرا
میرے پندار و خودی کی یہ تباہی توبہ

ٹپکنے پڑتے ہیں جبیں سے مری لاکھوں سجدے　　اور پھر پائے محبت پہ! الٰہی توبہ!!

روح مسرور ہے ہر غم سے سبکدوش ہوں میں
بے سکونی کو مبارک ہو کہ مدہوش ہوں میں

وداع

نہ پھولوں کے ہاروں میں نزہت ہے باقی　　نہ راتوں کی باتوں میں لذت ہے باقی
نہ وہ صبح ہونے کی ہیبت ہے باقی　　نہ وہ چاندنی کی صباحت ہے باقی

تو کیا وقتِ رخصت قریب آگیا ہے؟

مرے دل کی اُلجھن سوا ہو رہی ہے　　نظر میری یاس آشنا ہو رہی ہے
طبیعت بہت بد مزا ہو رہی ہے　　مری روح بھی غمزدا ہو رہی ہے

تو کیا وقتِ رخصت قریب آگیا ہے؟

وہ راتوں کو تا دیر افسانہ خوانی　　وہ جذبوں کی مستی وہ کیفِ جوانی
وہ کافر تبسم کی بادہ چکانی　　یہ سب ختم سی ہو رہی ہے کہانی

تو کیا وقتِ رخصت قریب آگیا ہے؟

خرامِ رنگیں

اٹھکیلیاں کرتی ہوئی مانندِ نظر جا — آنچل کو سمیٹے ہوئے نظروں سے گذر جا

دزدیدہ سی چتون، یہ اچٹتی سی نگاہیں — نشانے حیا ہے کہ جھکائے ہوئے سر جا

یہ وقت کہ آزاد ہے نظارہ خوددار — یہ وقت کہ تخئیل میں روا جا ہے نہ پر جا

اس وقت کہ پھولوں میں بنا کرتی ہے شبنم — تو باغ میں آئینۂ گل بن کے سنور جا

اس وقت کہ مستی میں ہیں سرشار ہوائیں — پی ساغرِ فطرت سے شراب اور ٹھہر جا

اس وقت کہ جنت کی برستی ہیں پھواریں — آ اور محبت کدہ دل میں سنور جا

اے تیری ہی اُف یہ تری رنگیں خرامی — ہر گل کو تمنا ہے ذرا بات تو کر جا

یہ پیکرِ رعنا، یہ خرام اور یہ مستی — ہر ذرے کی آغوش میں اک حشر ہی ہر جا

تو موج ہے دامانِ نسیمِ سحری کی — چھپنا ہی تو غنچوں کے حجابوں میں اتر جا

گنجائش باقی نہ رہیں نقش دگر کی — تصویر میں عریاں ہو، تصور میں ابھر جا

مرکز ترے جلووں کا ہے آغوشِ محبت — نکہت کی طرح تو نہ اِدھر اور اُدھر جا

ہر دل ترے انوار کا گہوارہ نہیں ہے

خورشید ہے تو شبنمِ آوارہ نہیں ہے

پیام

مشرق سے جانے والے سُن لے پیام میرا
یورپ پہ ہوگا اک دن نقشِ دوام میرا

ظلمت میں ہے سحر نے بھیجا سفیر اپنا
چمکے گا مہر بن کر دنیا میں نام میرا

گمنام رہ کے پھرنا شانِ سفر نہیں ہے
مشہور مجھ سے پہلے ہوگا کلام میرا

میں سانس لونگا اک دن یورپ کے ساحلوں پہ
مدّت سے کارواں ہے گرمِ خرام میرا

میرا جرس چلے گا جب کارواں بدامن
جادے پہ گونج اُٹھے گا ہر ایک گام میرا

مِٹ جائیگی یہ دوری، وہ دور آرہا ہے
محتاج وقت کا ہے سرا اہتمام میرا

نکلوں گا کیف بن کر میخانۂ کہن سے
ساقی کی بزمِ نو میں چھلکے گا جام میرا

تصویر میں شفق کی رنگِ سحر بھرونگا
اک روز یہ کرشمہ دیکھے گی شام میرا

پابوس میری ہوگی ہر رہگذارِ رنگیں
ہوجائے گا یہ پختہ سودائے خام میرا

لندن کے جانے والے اے مقتدر مُسافر!
مغرب کی محفلوں سے کہنا سلام میرا

چاند تارے

مری فضا میں نور خیز، میری نظر میں رقص بار
مہکے ہوئے سے چند پھول اُڑتے ہوئے سے کچھ شرار

دعوتِ عشرتِ نگاہ یہ مجھے دے رہے ہیں کیوں
بزمِ جہاں میں مجھ کو ہے اور کسی کا انتظار

مجھ پہ ہی کیوں اثر فگن جگنوؤں کی یہ انجمن
موتیے سے بھرا چمن مجھ پہ ہی کیوں سحر بار

ہاں میں نہیں شگفتہ دل، ہاں مرا دل اُداس ہے
شورشِ کائنات سے ہے مری روح بے قرار

ساقیٔ فطرتِ حسیں، میں ترا بادہ کش نہیں
مجھ کو دکھا نہ جام و مے، میں نہیں تشنۂ خمار

دور اور آہ اتنی دور اُڑ کے بھی میں نہ جا سکوں
جن کو کبھی نہ چھو سکوں کیا ہو وہ پھول خوشگوار

اہلِ جنوں کو دشت میں کوئی سکون ہو تو ہو
آہ! فریبِ بزم سے، ہے مرے دل کو انتشار

خلوتِ غم ہے اور میں اور ہیں جمع آس پاس
خاک ملا ہوا سرور، آگ لگی ہوئی بہار

رات کے سینکڑوں حجاب میری نظر پہ ڈال دو
بزمِ فلک پہ ہو نہ جائے رازِ ملال آشکار

پردۂ خاص چاہیے میرے خیال کے لئے

میری طرح جو دہر میں محوِ مآلِ کار ہو
کیوں نہ نشاطِ ماسوا اس کی نظر پہ بار ہو

دل کو ہے اسکی جستجو ہو جو تمام رنگ و بو
جس کے ہر ایک جلوے پر شوق کو اختیار ہو

ایسے نجوم و ماہ سے کھیلنا چاہتا ہوں میں
جن کی ہر اک شعاعِ نو قلب پہ نور بار ہو

مطلعِ کیف و نور پر لاؤ مرے لئے وہ صبح
شام نہ ہو جسے نصیب، جو مجھے سازگار ہو

رات مجھے جگائے کیوں چاند مجھے ستائے کیوں
کوئی مجھے رُلائے کیوں کیوں کوئی غمگسار ہو

آتشِ ہر نفس سے ہوں تازہ نجوم آشکار
دامنِ نازِ حسن ہو دیدہ اشکبار ہو

جلوہ بے ثبات نے دعوتِ شرک کیوں مجھے
وحدتِ عشق جب مرا مستقل اک شعار ہو

لالہ و گل سمیٹ لیں اپنی بساطِ رنگ بو
محفلِ ماہ سے کہو پردہ رہگذار ہو

وقف ہے میری ہر نظر جذبِ جمال کے لئے

سادگی

سادگی انسان کا اک جوہرِ خود رنگ ہے
ملہمانہ ہے جو نغمہ، بے نیازِ چنگ ہے

سادگی آثارِ فطرت کا ہے اک ہی لباس
جس کے نقش و رنگ سے چشمِ تماشا دنگ ہے

رہینِ آرایش ہے تیرا ذہنِ آشفتہ خیال
جانتا ہوں میں ترا ظرفِ بصیرت تنگ ہے

تو بناوٹ کا پجاری سادگی پر میں فدا
وہ تجھے شایانِ نازش ہے جو میرا ننگ ہے

صنعتِ آب و رنگِ ذاتی کو ہٹا سکتی نہیں
حسنِ سادہ پر نمائش غالب آ سکتی نہیں

تلاشِ سکوں

جب زمانے کی بلاخیزی سے گھبراتا ہوں میں
شورشِ افراد سے جب تنگ آجاتا ہوں میں

جب سمجھتا ہوں کہ دُنیا کی حقیقت کچھ نہیں
زندگی ہے اک فسانہ، واقعیت کچھ نہیں

جب سمجھتا ہوں کہ بحرِ زندگانی ہے سراب
اور اک دھوکا ہے مطلق یہ فنا زارِ خراب

جب نظر پڑتی ہے میری پردہ ہائے ساز پر
بجلیاں سی کوند جاتی ہیں دلِ غماز پر

چاہتا ہے دل کہ سازِ زندگی برباد ہو
روحِ فانی اس غلام آباد سے آزاد ہو

دل نہیں لگتا کہیں بھی بزمِ فانی میں ضیا
منظرِ عشرت سے ہوتی ہے پریشانی سوا

ہے تقاضائے جنوں صحرا نوردی کیجیے
ہو سکوں حاصل جہاں جا کر وہاں دم لیجیے

میرا مامن میرا مسکن گوشۂ صحرا میں ہو
کوئی ہمراہی نہ میرا گوشۂ تنہا میں ہو

مجھ کو مطلب ہی نہ ہو اس بزمِ فانی سے کوئی
کنجِ عافیت میں کٹ جائے یہ ساری زندگی

ہو مری دُنیا وہی میرا وطن بھی ہو وہی
بعدِ مُردن مرکزِ گور و کفن بھی ہو وہی

عہدِ حاضر کا نوجوان

بادلوں کے ساتھ اڑتی تھی کبھی اپنی نظر
طائرِ تخیل کی، یہ آسماں تھے رہگذار

ذہن پُرعظمت، جواں ہمت، لہوں میں جوش تھا
زندگی بادہ تھی لب پر ذکرِ نا و نوش تھا

لفظِ "ناممکن" سے تھی ناآشنا اپنی لغات
اک اشارے سے ہلا دیتے تھے ساری کائنات

جب قدم اٹھتے تھے، اٹھتے تھے سوئے میدانِ جنگ
کوندتی تھی جب نظر دنیا نظر آتی تھی تنگ

قوت و ہمت اٹل تھی کوہساروں کی طرح
ساری دنیا رقص میں تھی آبشاروں کی طرح

جادۂ دشوار کو منزل بنا دیتے تھے ہم
کارواں کو ایک ٹھوکر سے جگا دیتے تھے ہم

ہم خودی و خودشناسی کے علم بردار تھے
خود ہی اپنی رفعت و عظمت کے ذمہ دار تھے

ہر روش میں زندگی کی جلوہ گر رہتے تھے ہم
شورشِ طوفاں میں بھی سینہ سپر رہتے تھے ہم

یا یہ حالت ہے زمیں سے اب نظر اٹھتی نہیں
سانس کی کمزوری سے زندگی کٹتی نہیں

ذہن میں کمزوریوں نے آ کے لی ہے پناہ
اب تصور بھی جہانِ رنگ و بو کا ہے گناہ

نظمِ ہستی کیا، نظامِ نفس بھی دشوار ہے
عہدِ حاضر کے جواں پر اپنی ہستی بار ہے

اب قدم اٹھتے ہیں لیکن ناتوانی کے ساتھ
اب ہے رسم و راہ انفاسِ مسیحائی کے ساتھ

پہلے اس کا جوہرِ خوں دشنہ و خنجر پہ دیکھ
اور اب اس نوجواں کو ڈاکٹر کے در پہ دیکھ

اسٹیج کی ملکہ سے

اے کہ کیفِ سرخوشی تیری اداکاری میں ہے
اک فسونِ پنہاں ترے جلوؤں کی بیداری میں ہے

جانتی ہے تو کہ اک عالم ہے شیدائی ترا
اس لیے مصروف دنیا بھر کی دل داری میں ہے

اے طلائی اور سیمیں چند ٹکڑوں کی کنیز
تیرا رازِ زندگی جیبِ خریداری میں ہے

قیمتی ملبوس میں دیتی ہے نظروں کو فریب
خوبصورت ایک دھوکا تو ریاکاری میں ہے

سحرِ موسیقی بھی ہے تجھ میں وقارِ حسن بھی
یعنی نیکی کی چمک تیری گنہگاری میں ہے

ذہنِ شاعر میں بھی تو ہی فکرِ ناثر میں بھی تو
نظم میں موضوع ہے عنوان، نثاری میں ہے

تو کبھی اسٹیج پر ہے واقعی تمثیلِ عشق
اور کبھی اہلِ ہوس کی نازبرداری میں ہے

اہلِ محفل کی زبانوں پر حکایت ہے تری
جانتا ہوں میں کہ دنیا بھر میں شہرت ہے تری

ہے اگر نگہت تو کس گلزار سے آئی ہے تو
اور طوطی ہے تو کس کہسار سے آئی ہے تو

ترا میکہ جب نہیں اسٹیج تو پھر سچ بتا
کس کی آغوشِ حیا بیزار سے آئی ہے تو

ہے جبیں پر تیری قشقہ بھی نظر میں کیف بھی
دیر سے یا خانۂ خمار سے آئی ہے تو

کیوں تماشائی سمجھتے ہیں تجھے زہرہ جمال
ضو فشاں کِس مرکزِ انوار سے آئی ہے تو

تو کسی عشرت کدے سے لُٹ لُٹا کر آئی ہے
یا کسی کاشانۂ خود دار سے آئی ہے تو

اے مہِ ارضی، حقیقی تیری منزل ہے کہاں
چار دیواری سے یا بازار سے آئی ہے تو

ہو چکی ہیں کیا زمانے میں تری بدنامیاں
یا نکل کر پردۂ اسرار سے آئی ہے تو

ہے جو باعصمت تو بے شک حُسن کا تارا ہے تو
ورنہ چھوڑ اسٹیج ! ــ نیچے آ ــ کہ آوارا ہے تو

دل اور فطرت

طائرِ آزاد ہیں غم ان کو مگر کچھ بھی نہیں
موجِ دریا کو تلاطم کی خبر کچھ بھی نہیں

چاند سورج کی خموشی سے سکوں پیدا ہے
رات اور دن پہ اداسی کا اثر کچھ بھی نہیں

گُل شگفتہ ہو کہ افسردہ، ہے آسودہ باغ
سبزہ زاروں میں خلش بخشِ نظر کچھ بھی نہیں

کوہساروں کی فضاؤں کو میسّر ہے سکوں
آبشاروں میں بجز نغمۂ تر کچھ بھی نہیں

یعنی مقصود ہے فطرت کو سکوں اپنا ہی
ہر طرف بارشِ تسکیں ہے اِدھر کچھ بھی نہیں

دلِ تشنہ کا سکوں بھی یوں ہی ممکن ہوتا
کاش فطرت کا یہ اک ذرّہ ساکن ہوتا

دعوتِ نظر

آج اے چشمِ تصوّر دوست کی تصویر دیکھ
حُسن کی تابانیوں میں عشق کی تنویر دیکھ

دیکھ خاموشی کا وہ عالم جو ہے ہیجان خیز
اور پھر اس خامشی میں شوخیٔ تقریر دیکھ

حُسن بن جاتا ہے کیونکر عشق کی جلوہ سرا
عشق کی رنگیں نگاہِ حُسن کی تدبیر دیکھ

دیکھ تاروں کی ضیا میں حُسن کو محوِ سرود
چاند کے معصوم تاباں خواب کی تعبیر دیکھ

باغ کے رنگین غنچوں کو ملی ہے زندگی
صفحۂ قرطاس پر کلیوں کی یہ تفسیر دیکھ

آج اے چشمِ تصوّر دعوتِ تجدید ہے
تیرے اور میرے مذاقِ عشق کی پھر عید ہے

دیکھتا ہوں دوست کی تصویر تاروں میں خموش
چاند کی کرنوں میں آتی ہے نظر جلوہ فروش

جس طرح ہو ساقی کی دوش پر رنگیں ردا
نغمہ پیرا ہو جس طرح ہو آبشاروں میں سروش

دیکھتا ہوں سبزہ زاروں میں اُسے مصروفِ سیر
سُن رہا ہوں نغموں میں دوست کو محوِ خروش

دیکھتا ہوں بے خودی کی موج میں اسکو رواں
وہ نظر آتا ہے جب مجھ کو نہیں رہتا ہے ہوش

دیکھتا ہوں اس کو اپنے دل سے میں بالکل قریب
جب کبھی چشمِ تصوّر میں مری آتا ہے جوش

جب تصوّر کو بحدِّ فکر پھیلاتا ہوں میں
دوست کی تصویر کیا خود دوست بنجاتا ہوں

اُمنگ

فروغِ ماہتاب میں، عروجِ آفتاب میں
سمندروں کے جزر میں ہوا کے پیچ و تاب میں

جوانِ مغنیہ کی ہر صدائے کامیاب میں
سرودِ نغمہ اور دلربائیٔ رباب میں

بہار و برگ و بار کے اُٹھان میں چھپی ہوئی
سمن میں یاسمین میں، رنگ و بو کے ہر حجاب میں

تجلّیوں میں برق کی، روانیوں میں ابر کی
تڑپ میں موج موج کی، نمائشِ حباب میں

سحر کی طلعتوں میں اور عشرتوں میں شام کی
نوائے آبشار اور مستیٔ شراب میں

جنوں کے جوش و جذبۂ وفا میں کھیلتی ہوئی
نگاہِ عشق اور حسن کی ادائے خواب میں

نشیلی انکھڑیوں کی دلنشینیوں میں جاگزیں
تبسّمِ جمال میں، تلاطمِ شباب میں

یہ اک فور و جوش کا جو بے پناہ رنگ ہے
اُمنگ ہے اُمنگ ہے اُمنگ ہی اُمنگ ہے

اُمنگ سے نظر نواز ہیں نئی جوانیاں
اُمنگ سے زبانِ حسن پر ہیں لن ترانیاں

اُمنگ ہی نے قابلِ مطالعہ بنائے ہیں
یہ قصّہ ہائے عشق یہ جمال کی کہانیاں

اُمنگ سے وہ رفتہ رفتہ بے رخی کی سازشیں
وہ چپکے چپکے جذبۂ ستم کی مہربانیاں

حجاب سے بھی غمزۂ نہاں کی تیر افگنی
نقاب سے بھی عشوۂ جواں کی ضو فشانیاں

اُمنگ ہی کی سوختہ دلوں کا ایک ثبوت ہیں
سحر کی انجمن میں کچھ جلی ہوئی نشانیاں

ہیں روح کی اُمنگ یا خیال کی اُمنگ سے
سخنوروں کے ذہن عرش بوس کی روانیاں

اُمنگ ہی کا کھیل ہیں، اُمنگ ہی کی برکتیں
فرشتوں کی سی ماں کی گود میں یہ شادمانیاں

اُمنگ نقصِ عالمِ شہود کا کمال ہے
اُمنگ ہے وہ سیل جس کا روکنا محال ہے

اُمنگ پر شباب میں ہے جذبہ نہاں مرا
میں چاہتا ہوں دورِ زندگی ہو کامراں مرا

جو گلشنِ جہاں میں اپنا آشیاں بناؤں میں
تو شاخِ سدرہ سے بلند تر ہو آشیاں مرا

بساطِ خاکداں پہ خود بنائیں ہمتیں مری
لطیف و روشن ایک جادہ مثلِ کہکشاں مرا

بغیرِ زحمتِ سفر بغیر دعوتِ درا
ہو کامیابِ منزلِ اُمید کارواں مرا

نئی بلندیاں ہوں آشکار میری فکر سے
زمین کے لئے ہو اک پناہ آسماں مرا

کروں میں یوں تحفظِ حیات اپنی عزم سے
کہ ایک نقش بھی نہ ہو جہاں سے رائیگاں مرا

نہ میں مٹوں نہ میرا نام بزمِ دہر سے مٹے
جہاں ملی ہے زندگی وہیں ملے نشاں مرا

یں رہ نہ جاؤں بنکے ایک ڈھیر خشت و سنگ کا
حیاتِ جاوداں مآل ہو مری اُمنگ کا

برسات کی ایک رنگین شام

وہ شام، وہ گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی سی
زلفوں کی طرح مست سی لہرائی ہوئی سی

چھڑکا ہوا وہ رنگ سا ہر ایک روش پر
وہ آگ گل و لالہ کی بھڑکائی ہوئی سی

فواروں کی آواز طرب خیز و گہر بار
بھیگی ہوئی بیٹھی ہوئی بھرائی ہوئی سی

ہلکی وہ پھواریں وہ لرزتی ہوئی بوندیں
خوشبو سے مہکتی ہوئی مہکائی ہوئی سی

وہ سرد ہوا اور وہ جمنا کا کنارہ
ہر موج وہ مچلی ہوئی بل کھائی ہوئی سی

ہمراہ مرے "تاج" میں وہ اُن کا ٹہلنا
رنگین لبوں پر وہ ہنسی آئی ہوئی سی

سبزے کا نزاکت سے وہ دب دب کے ابھرنا
رفتار وہ بہکی ہوئی اٹھلائی ہوئی سی

سیاحوں کی نظروں سے وہ بچ بچ کے نکلنا
وہ سانس ذرا تیز سی گھبرائی ہوئی سی

ماتھے پہ تھکاوٹ سے وہ ہلکا سا پسینہ
مستی لبِ گلرنگ پہ اترائی ہوئی سی

احساس نمایاں سا ہر اندازِ حسیں سے
ہر بات اشاروں میں وہ سمجھائی ہوئی سی

وہ "تاج" کے جلوے وہ ضیائے رُخِ روشن
وہ دور تک اک چاندنی پھیلائی ہوئی سی

جب تک یہ زمیں "تاج" سے آباد رہے گی
برسات کی وہ شام مجھے یاد رہے گی

شکستِ ہوس

ایک انساں چھیڑتا تھا دہر میں الفت کا ساز　　فطرتِ عالم میں پیدا ہو رہے تھے سوز و گداز

زد میں جو بھی آتا تھا اس کی، تھا محبت کا اسیر　　ایک ہی قالب میں لاکھوں رنگ کے ڈھلتے تھے تیر

چند شیطاں زادیاں بھی حور بنکر آ گئیں　　ذہن کا تو ذکر کیا ہے ذہنیت پر چھا گئیں

جھومتی تھیں ساز کے نغمات پر سرشار تھیں　　مشتری کی ہمنوا تھیں اور زہرہ کار تھیں

بڑھ کر آخر ایک نے اس ساز پر قبضہ کیا　　گردِ رنگیں نے لطیف آواز پر قبضہ کیا

ایک "عورت" بن کے بیٹھی اسکی خلوت گاہ میں　　معصیت کی یوں ہوئی تخلیق الفت گاہ میں

ایک اس محفل میں "دولت" بن کے اترانے لگی　　ایک بدمستی میں ناگن بن کے لہرانے لگی

تھا یہ مقصد ہو حکومت دہر میں شیطان کی　　کھینچ لی جائے یہاں روحانیت انسان کی

سینکڑوں پہلو نکالے دلربائی کے لئے　　سینکڑوں طوفاں اٹھائے ناخدائی کے لئے

ایک ہرجائی قدم پر عشق تھا صرفِ سجود　　پاؤں کی ٹھوکر سے ہوتی تھی محبت کی نمود

جل رہا تھا دہر میں کل تک محبت کا چراغ　　ہو رہی تھی روحِ انساں جس کی ضو سے باغ باغ

شورشِ نَو سے معطّل ہوگیا اس کا دماغ
نذرِ ہنگامہ ہوا، اس کا سکوں اس کا فراغ

جب محبّت کے اُجالوں میں ہوس کو ہو فروغ
جب سکوتِ روح میں شورِ نفس کو ہو فروغ

جب ہوس چھا جائے لعنت بن کے انساں کے ذہن پر
جب تغافل کا تسلّط ہو دلِ بیدار پر

جب ہوس پُر شوق نظارے کو دے رنگیں فریب
جب ہوس سے جذبۂ پاکیزگی ہو ناشکیب

جب ہوس کی ہو خدائی اور ہوس کا اختیار
جب ہوس کا مشغلہ ہو اور ہوس کا کاروبار

کیوں نہ سازِ عشق کی سادہ نوا خاموش ہو
کیوں نہ تاریکی زیادہ ہو، ضیا خاموش ہو

دیوتا نے عشق کے انگڑائی لی، لرزی کماں
جگمگا اُٹھیں ہوس کی کچھ نئی چنگاریاں

سر کیا اک تیر کیوپڈ نے ہوس کے ساز پر
بجلیاں سی گر گئیں جسمِ ادا و ناز پر

دوزخی حوروں کے رُخ سے اٹھ گیا آخر نقاب
اپنی اصلیت میں ظاہر ہو گیا کفرِ شباب

عشق تصویرِ ہوس میں گشتہ آواز تھا
گو ہوس کا ساز اب مطلق شکستہ ساز تھا

دُھل گیا رُخ سے ہوس کے غازۂ مکر و ریا
کُھل گیا وہ راز جو اک روز کھلنے کو ہی تھا

ہو گیا ہر مکرِ شیطاں زادیوں کا بے نقاب
سازشِ رنگیں میں آخر آ گیا اک انقلاب

یہ ہوا اُن مستیوں کا حشر جو مختار تھیں
اپنے مرکز سے ہٹیں تو شاہدِ بازار تھیں

اب گندی مچھلیاں ہیں اپنی ظلمت سے تباہ
غوطہ زن بحرِ ہوس میں ہیں نہیں ملتی ہے راہ

رفتہ رفتہ پھر بلندی پر ہوا اُلفت کا ساز — سازشوں سے بے تعلق شورشوں سے بے نیاز

دامنِ انجام پھر وابستۂ آغاز تھا
پھر وہی محفل وہی اُلفت کا رنگیں ساز تھا

صلائے نو

ہم نشیں آ میں بتاؤں تجھ کو، کیا ہے زندگی — اک حقیقت ایک رومان اک ضیا ہے زندگی

زندگی آلائشِ دنیا سے بالکل پاک ہے — حور کا آنچل فرشتوں کی ردا ہے زندگی

زندگی کا ایک مظہر ہے یہ ساری کائنات — ہر قدم پر زندگی ہے جا بجا ہے زندگی

ماورائے آدمیت زندگی کی وسعتیں — دہر کی ہر چیز میں جلوہ نما ہے زندگی

زندگی چاروں طرف سے ہم کو ہی گھیرے ہوئے — ابتدا بھی زندگی اور انتہا ہے زندگی

آ کہ ہم مل کر حیاتِ جاودانی دیں اسے — دیر سے خود آرزو مندِ بقا ہے زندگی

کچھ نئے رومان بھر دیں پھر خلائے زیست میں — کیوں رہے ناقص جب اتنی خوشنما ہے زندگی

ربط دیں انسانیت میں اور محبت میں نیا — آخر ان دونوں کی مرہونِ بنا ہے زندگی

کھول دیں انسان کے دل میں نئی اک شاہراہ — رسم و آدابِ کہن میں مبتلا ہے زندگی

شعریت میں جھوم کر دنیا کا نظارہ کریں
زندگی کی شعر پیدائی کا اندازہ کریں

حافظ خدا تمہارا

بن کر بہار جاؤ
مثلِ نسیم آؤ
پھولوں میں جگمگاؤ
کلیوں میں مسکراؤ
پھر ہو وہی نظارا   حافظ خدا تمہارا

(۲)

مُرجھا گیا ہے دل بھی
چھائی ہے بے کسی سی
کلیاں ہیں سوکھی سوکھی
سارا چمن ہے وحشی
چشمِ کرم خدارا   حافظ خدا تمہارا

(۳)

یہ باغ کی بہاریں
کلیوں کی یہ قطاریں
کوئل کی یہ پکاریں
گلشن کو کیا سنواریں
ہے کس کو اتنا یارا حافظ خدا تمھارا

(۴)

برسات کا یہ موسم
تنہائی کا یہ عالم
سامانِ عیش بر ہم
اک دل ہزار ہا غم
کیونکر کریں گوارا حافظ خدا تمھارا

(۵)

جس طرح شب کو چھپ کر
خورشیدِ نور پیکر

وقتِ سحر فلک پر

ہو جائے جلوہ گستر

آنا یوں ہی دوبارا حافظ خدا تمہارا

(۶)

ہے غم کے بعد راحت

فرصت کے بعد عشرت

بس اک نگاہِ اُلفت

ہے یادگارِ رخصت

دل ساتھ ہے ہمارا حافظ خدا تمہارا

گلبانگ

غزلیات

(۱)

مری نگاہوں کا فیصلہ ہے کہ ہے نظارہ محال تیرا
سُنا کیا عمر بھر یہی میں کہ ہے تقرب محال تیرا
یہ نقص اندراک ہی حقیقت میں فہم کامل کا آئینہ ہے
نہ گُل یہاں رنگ و بُو کے۔ نہ باغباں ایک سی نمو کے
میں عشق کو اک نہ مٹنے والی حیات دینے کی فکر میں ہوں
مٹا سکا آج تک نہ انساں کی روح اور دل کی تیرگی کو
میں اپنے دل میں کبھی کبھی تجھ کو پچھلی راتوں میں دیکھتا ہوں
اب اپنی محفل میں کھینچ لے اپنے ہاتھ سے ہاتھ تھام میرا

(۲)

ہزار گونہ تجلیوں سے گھرا ہوا ہے جمال تیرا
مگر مرے جلوہ دوست دل سے کبھی نہ نکلا خیال تیرا
ہر ایک ذہن رسا میں ہے کچھ نہ کچھ ظہور کمال تیرا
تمام شکلوں میں دیکھتا ہوں تصوّر بے مثال تیرا
مجھے یہ جب سے یقیں ہوا ہے کہ حسن ہی لازوال تیرا
یہ تیرا سورج یہ تیرے تارے یہ بدر تیرا ہلال تیرا
یہی ہے شاید تری توجہ یہی ہے شاید وصال تیرا
کہ مہر شایاں نہیں رہا ہے یہ عالم پائمال تیرا

ضیا اگر تو نہیں پیمبر تو ہے یقینی فرشتہ ہونا
کبھی کبھی بامِ سدرہ سے بھی نکل گیا ہے خیال تیرا

رنگِ فسردگی میں نہ رنگِ خزاں میں آ
بن کر کبھی بہارِ مرے گلستاں میں آ

دیدی ہے زندگی ابدی دل کو عشق نے
آ تو بھی میری انجمنِ جاوداں میں آ

میں واقفِ صلاحیتِ رسم و راہ ہوں
منزل کا ذوق ہے تو مرے کارواں میں آ

جن کو زباں گا نہیں سکتی وہ گیت سُن
نغمہ پرست ہے تو کسی سازِ جاں میں آ

آغوش اگر نہیں ہے تری قسمتِ فغاں
حُسنِ قبول تو ہی کنارِ فغاں میں آ

بدنظمیاں کمال کی حد تک پہونچ چکیں
خود بن کے خضرِ راہ نظامِ جہاں میں آ

اب غم کے انہماک سے جی سیر ہو گیا
بنکر کبھی خوشی دلِ ناشادماں میں آ

ہے ساحلِ سکوں کی اگر تجھ کو جستجو
مثلِ حباب شورشِ آبِ رواں میں آ

میں ہی تو ہوں بہارِ ریاضِ جہاں ضیا
پھر کس سے کہہ رہا ہوں مرے بوستاں میں آ

(۳) (۹)

پرکھنا ہے جو دُنیا کو تو پہلے کر نظر پیدا
کہ اپنی ہی نظر کرتی ہے تنقیدی اثر پیدا

فضائے تیرہ و تار اک دن تجلی بن کے اُبھرے گی
شبِ دیجور کے سینے سے ہوتی ہے سحر پیدا

نظر میں قوتِ پرواز ہو اور عزم مستحکم
تو پھر مشکل نہیں ہو جائے شاہیں سا جگر پیدا

نظر سطحی تماشائے جہاں پر رقص کرتی ہے
نگارستانِ عالم میں کہاں ہیں دیدہ ور پیدا

یہ ہنگامے ذرا سی دیر کو خاموش ہو جائیں
کہ میرے ذہن میں اک ہو رہا ہے شعرِ تر پیدا

یقیں یہ ہے جہانِ محبت تجلی بن کے رہ جائے
دلوں میں زندگی کی ایک چنگاری ہو گر پیدا

نہیں ہوتی ہمیشہ جادۂ ہستی میں تنہائی
مسافر خود ہی کر لیتا ہے اپنا ہم سفر پیدا

ہیں غایت شورشِ عالم کی سمجھا حدِ غایت تک
ہوا جب میرے پہلو میں دلِ شوریدہ سر پیدا

ضیا میں باعثِ نیرنگ و تخلیقِ تنوع ہوں
(۴) مری گردش نگاہی سے ہوئی شام و سحر پیدا (۹)

پردۂ ساز میں بھی سوز کا حائل ہونا
شمع سے سیکھ شریکِ غمِ محفل ہونا

بزمِ ہستی پہ ہے مشکل مرا مائل ہونا
مجھے آتا نہیں سرگشتۂ باطل ہونا

ناخدا تو مجھے آلودۂ طوفاں نہ سمجھ
موجِ دریا کو سکھاتا ہوں میں ساحل ہونا

سازگار آج مجھے جادہ بھی ہے رہبر بھی
میری قسمت میں ہے آسودۂ منزل ہونا

رشتۂ ہوش ہے وابستہ تجھی سے اے دوست
کبھی ممکن نہیں تجھ سے مرا غافل ہونا

دل سے ہشیار کہ ہے دل ہی ترا عینِ حیات
موت سی بھی ہے سوا بے خبرِ دل ہونا

سعی کے بعد نہ کر کاوشِ فکرِ انجام
لعنتِ سعی ہے زحمت کشِ حاصل ہونا

بارشِ ابر سے بجلی کی لگی بجھ نہ سکی
غیر ممکن ہے علاجِ تپشِ دل ہونا

ہر قدم پر رہِ ہستی میں نئی ٹھوکر ہے
(۵) اے ضیا سہل نہیں فائزِ منزل ہونا (۹)

حاملِ عظمتِ فطرت دلِ انساں نکلا
ہم جسے پھول سمجھتے تھے گلستاں نکلا

راس آئی نہ کسی کو بھی یہ محفل یارب
کہ جو نکلا تری دنیا سے پریشاں نکلا

غنچۂ گل کو سکھا دونگا مذاقِ پرواز
میں جو گلشن میں کسی روز پرافشاں نکلا

میں تو سمجھا تھا اُسے بے خبر و مستغنی
وہ تو ہر ذرّۂ عالم کا نگہباں نکلا

بے جنوں آئی تھی کیا فصلِ بہاری امسال
آستیں چاک ہوئی اور نہ گریباں نکلا

دل جسے مہرِ جہاں تاب سے اک نسبت تھی
ایک بجھتا سا چراغ تہِ داماں نکلا

کبھی تردامنِ آلائشِ دُنیا نہ ہوا
زہے قسمت کہ میں آسودۂ طوفاں نکلا

جسے عشرت کدۂ دہر سمجھتا تھا میں
آخرِ کار وہ اک خوابِ پریشاں نکلا

گفتگو غنچۂ لب بستہ نے کی مجھ سے ضیا
بہرِ گلگشت جو میں سر بگریباں نکلا

(۶) (۹)

دُنیا میں جو آیا وہ بیگانۂ ہوش آیا
میں محفلِ ساقی سے اندیشہ بدوش آیا

کل رات کوئی اے دل صد جلوہ بدوش آیا
تو نے بھی نہ رویت کی تجھ کو بھی نہ ہوش آیا!

اس محفلِ عالم کی فطرت ہی میں ماتم ہے
مجبورِ فغاں تھا میں ہر چند خموش آیا

یہ مشربِ ساقی سے اعراض کیا کس نے؟
ہشیار میں اُٹھتا ہوں سنبھلو مجھے جوش آیا

پھر وحشتِ دل بھڑکی، پھر سوز ہوا طاری
پھر آج مرے آگے افسانۂ دوش آیا

شورشکدۂ عالم میں کیا میری صدا سنتا　　انسان جو دنیا میں صد پنبہ بگوش آیا
سب شیشہ و پیمانہ بے کیف و مسرت ہیں　　یہ کون بہ یک عشوہ میخانہ فروش آیا
انسان خموشی سے پھر مائلِ غفلت ہے　　نالوں کی اجازت دے پھر وقتِ خروش آیا

ہے غفلتِ عالم کا احساس ضیاؔ مجھ کو
میں سب کو جگا دوں گا جس دن مجھے ہوش آیا

(۷)　　(۹۱)

کیا زمانے نے گر مجھ کو رائیگاں، پھر کیا؟　　کہیں اُبھر نہ سکے گا مرا نشاں پھر کیا؟
بہار آتے ہی اک انقلاب آئے گا　　مجھے نصیب ہوا بھی جو آشیاں پھر کیا؟
یہ منزل اور کوئی راستہ بنا لے گی　　پہنچ گیا ہے جو منزل پہ کارواں پھر کیا!
خزاں ازل سے ہی ہے اس ہر ہیولیِٰ شگفت　　جو چند روز کو پھولا بھی گلستاں پھر کیا!
مری طرح بہت آسودۂ نشیمن ہیں　　مجھی پہ ٹوٹ پڑیں ساری بجلیاں پھر کیا؟
جو بات ہونی ہے پھر اس کی فکر لاحاصل　　مجھے مٹا کے مٹائے گا آسماں پھر کیا؟
کل ایک پیرہنِ نو بہار دے دیگی　　اُڑیں بھی آج گریباں کی دھجیاں پھر کیا؟
یونہی رہے گا مذاقِ سجود تو باقی　　جبینِ شوق ہوئی جذبِ آستاں پھر کیا!

ہر ابتدا کا ضیاؔ لازمی ہے اک انجام
رہا ہزار برس تو اگر جواں پھر کیا!

(۸)　　(۵)

زندگی بخش امیدوں پہ بھروسا کرنا　　میری اک عادتِ فطری ہے تمنا کرنا

کبھی رنگینیٔ گلشن کا تماشا کرنا　　کبھی نظارۂ ویرانیٔ صحرا کرنا

بیکسی دیکھئے اس وحشیٔ مستقبل کی　　جس کے بس میں ہو امروز کو فردا کرنا

دامنِ حرص کو، کوتاہ کر اے دستِ طلب　　شرم کی بات ہے فطرت سے تقاضا کرنا

اے ضیا ایسے اندھیروں میں ہے دنیا میری
ہے جہاں چاند کو دشوار اجالا کرنا

(۹)　　(۹)

سنسان ہے شبِ غم تسکین بدوش ہو جا　　دنیا نہ جاگ اٹھے اے دل خموش ہو جا

بزمِ چمن میں کب تک امیدِ جام و ساقی　　شبنم سے کہہ رہا ہوں بادہ فروش ہو جا

ہنگامۂ جہاں سے کان اپنے بند کر لے　　نغمے سن اپنے دل کے محوِ سروش ہو جا

ہستی کو اپنی کھونا پامالِ راہ ہونا　　عشرت ہے بیخودی کی بیزارِ ہوش ہو جا

کر سیرِ بزمِ فطرت یا شورشوں میں گم ہو　　یا صرف آنکھ بن جا یا صرفِ گوش ہو جا

نقصِ غم و سکوں بھی توہین ہے وفا کی　　پہلو سے پھینک دل کو یا صبر کوش ہو جا

پھر دیکھ اپنے اندر فردوس کی فضائیں　　مثلِ بہار اک دن خود سبز پوش ہو جا

تجھ کو ملی تھی اے دل اک آہ کی اجازت　　یہ کس نے کہہ دیا تھا مطلق خروش ہو جا

بھر دے شرارِ رنگیں سازِ دلِ ضیا میں

اے نغمۂ محبت فردوس گوش ہو جا

(۱۰) (۷)

دل میرا غمِ عشق سے ممتاز رہے گا
اک راز ہے یہ اور یونہی راز رہے گا

کیوں دل میں کوئی زمزمہ پرواز رہے گا
یہ ساز یونہی تشنۂ آواز رہے گا

جھک جائیگا سر حسن کا درِ حسنِ وفا پر
وہ سارے زمانے میں سرافراز رہے گا

کھائیگا جو مضراب مرے نغمۂ غم کی
اس بزم میں باقی وہی اک ساز رہے گا

مجھ کو یہ توقع ہے مساواتِ وفا سے
انجام بھی وابستۂ آغاز رہے گا

اک نقش رگِ روح پہ رہ جائیگا مطرب
یہ نغمہ ترا اور نہ مرا ساز رہے گا

پروانۂ خورشیدِ حقیقت ہوں ضیا میں
سایہ بھی مرا مائلِ پرواز رہے گا

(۱۱) (۵)

افسانۂ حیات میں کہتا چلا گیا
دریائے غم کی موج میں بہتا چلا گیا

اک دن یہ ہے کہ کسل سے اٹھنا محال ہے
اک دن وہ تھا کہ رنج میں سہتا چلا گیا

لے کر گئی جہاں بھی مجھے وحشتِ خیال
میں بھی جنوں کے جوش میں بہتا چلا گیا

وہ شورشِ الم کی مسلسل صعوبتیں
یہ ظرف تھا مرا کہ میں سہتا چلا گیا

دنیا کے کان بند رہے لیکن اے ضیا
کہنا جو کچھ بھی تھا مجھے کہتا چلا گیا

(۱۲) (۶)

دل مرا تاریک تھا لیکن درخشاں ہوگیا
اک بصیرت کی نظر سے ماہِ تاباں ہوگیا

غل مچایا طائروں نے فصلِ گل رخصت ہوئی
آگ نغموں سے لگی گلشن بیاباں ہوگیا

کیوں گل و غنچہ کو ہنسنے کی گراں تکلیف دی
حسن کا رنگیں تبسم کیوں نہ ارزاں ہوگیا

اور سب گلشن میں مثلِ بوئے گل اڑتے رہے
تنگ میرے ہی لیے صحنِ گلستاں ہوگیا

اب نہیں میں تشنۂ بانگِ درائے کارواں
اب دلِ پرشوق میرا خود حدی خواں ہوگیا

کس کے جلووں کو ترستی ہیں مری نظریں ضیا
مسکرا کر کون یہ بادل میں پنہاں ہوگیا

(۱۳) (۵)

آنکھوں میں سما جانا، نظروں میں پھرا کرنا
فطرت سی ہے جلووں کی ممنونِ ضیا کرنا

نظارے کو مصروفِ انوارِ فضا کرنا
اک جذبۂ فطری ہے صحرا میں پھرا کرنا

سب رازِ خلش اپنا کہہ دینا اشاروں میں
پھر طعنۂ بے ضبطی پھولوں سے سنا کرنا

دینا کبھی تعلیمِ تسلیم و رضا دل کو
نالوں سے کبھی خود ہی اک حشر بپا کرنا

رہ جائے جو مٹنے پر دل کے بھی یونہی باقی
اے عشق ضیا کو بھی وہ سوز عطا کرنا

(۱۴) (۶)

بقا ملے گی وفا سے مجھ کو یہی تو حاصل ہے زندگی کا
سکونِ مطلق نصیب ہے یا ثمر ہے یہ میری بے کلی کا

وفورِ غم میں چھٹے ہیں نالے لیے لب نہ زنہار رک سکیں گے
حیا کے پردے نہیں ٹھہرنے والے یہ جوش ہے میری بے بسی کا

ہر اک غنچہ یہ آج گلشن میں مست ساقی سے کہہ رہا ہے — کہ ابر اٹھا ہی مست ہو کہ یہ عین موقع ہے میکشی کا

فضائے وحشت میں گونج کر رفتہ رفتہ یوں سو گئے ہیں نغمے — کہ جیسے خوابیدہ ہو تاثر کسی غم اندرونِ آدمی کا

حریمِ فطرت میں آج اے دل سنبھل سراپا شباب ہو جا — یہ چند لمحے ملے ہیں ان میں اٹھا بھی لے لطف زندگی کا

یہ آستاں ہے مرے دوست کا ہے یہ آستاں میری ملکیت ہے — یہاں کوئی سجدہ کیا کریگا یہ حق ہے میرا ہی بندگی کا

یہ فیضِ سیماب ہے کہ دنیا کی انجمن میں چمک رہا ہوں
ضیا طبیعت کی روشنی میں نکھار گویا ہے چاندنی کا

(۱۵) (۷)

دل آج کس طرف مجھے لیکر نکل گیا — عمرش دراز باد، مرا غم بہل گیا

دیکھا جو وقتِ صبح سرِ چشمۂ حسن کو — لے کر برائے نذر صبوحی کنول گیا

اے برقِ حسنِ دوست یہ تیری ادائیں — جانِ کلیم بچ گئی اور طور جل گیا

اب وہ نشاط ہے نہ وہ تسکینِ کائنات — موجِ نفس کے ساتھ زمانہ بدل گیا

رفتارِ شوق حدِ تعین سے بڑھ گئی — منزل سے بھی میں دو قدم آگے نکل گیا

کھو ہی دیا تھا موجِ تحیر نے شامِ غم — چٹکی جو لی خیال نے فوراً سنبھل گیا

یاد آ رہی ہیں مجھ کو ضیا اگلی صحبتیں
افسوس کتنی دور زمانہ نکل گیا

(۱۶) (۷)

بجھ گیا جب دل ہی، پھر یہ میرے کام آیا تو کیا — لے کے تسکیں ساقیٔ ماہِ تمام آیا تو کیا

کارواں جبتک نہ جاگے کِس طرح انگڑائی لوں
صبح کے پردوں سے منزل کا پیام آیا تو کیا

اے شہیدوں کے پیامی وقتِ ماتم اب کہاں
خون بھر کر تو شفق میں وقتِ شام آیا تو کیا

زندگی کا لطف کیا جب ہو نہ کوئی ہم مذاق
خضر کو گر مژدہ عمرِ دوام آیا تو کیا

آج اے ساقی زمانہ بھر پہ طاری ہے جمود
دورِ میں اک تیرے میخانے کا جام آیا تو کیا

کون جائے چھوڑ کر آزادیاں سوئے وطن
ہم ہیں غربت میں بہاروں کا سلام آیا تو کیا

میں نہیں تو یاد کرنے سے مجھے کیا فائدہ
اے ضیا بزمِ وطن میں میرا نام آیا تو کیا

(۱۷) (۹)

جذبہ جو تھا مری رگ و پے میں چھپا ہوا
آخر جنوں کے بھیس میں جلوہ نما ہوا

میں نے تو آگ دامنِ گل میں لگائی تھی
جل اٹھی میری شاخِ نشیمن، یہ کیا ہوا

وہ تھا مذاقِ عجز کہ بندہ بنا بشر
یہ حاصلِ خودی ہے کہ بندہ خدا ہوا

پھر کھینچ رہی ہے روح مری سوئے میکدہ
یا دل بھر آ رہا ہے کوئی جھومتا ہوا

کیا ہے، کچھ آنسوؤں کی جگہ بزمِ حسن میں؟
لایا ہوں موتیوں سے میں دامن بھرا ہوا

آئیں مری صدا پہ جو باقی ہوں قافلے
آیا ہوں وادیوں میں ابھی گونجتا ہوا

غمگین مجھ کو دیکھ کے گھبرا نہ ہم نشیں
مسرور ہو کہ آج مجھے دل عطا ہوا

ہے دیکھنے کی چیز دھندلکے میں صبح کے
سیارہ ٹوٹتا ہوا، دل ڈوبتا ہوا

یہ سب ہیں بزمِ عشق میں مہمان صبح تک
جگنو ہوا چراغ ہوا یا ضیا ہوا

(۱۸) (۸)

یاد ہے آہ کا وہ رنگ و نوا ہو جانا
یوں فضاؤں میں سمٹنا کہ گھٹا ہو جانا

اسقدر کیف کہ مدہوشِ فضا ہو جانا
دیکھنا ساز کو اور نغمہ سرا ہو جانا

حُسن کی فطرتِ معصوم تھی پابندِ حجاب
عشق سے سیکھ لیا جلوہ نما ہو جانا

رسمِ آدابِ محبت کا وہ پابند کہاں
جس کی تقدیر میں ہو نذرِ وفا ہو جانا

حُسن اک عشق کی سوئی کیفیت ہے
عشق ہے حُسن کا بیدارِ وفا ہو جانا

نئی زنجیر ہے دنیا کا ہر اک ہنگامہ
اصل میں قید ہے زنداں سے رہا ہو جانا

مستِ پندار سہی سازِ خودی کیوں چھیڑوں
بے خودی کو مری آتا ہے خدا ہو جانا

یاد ہے مجھ کو وہ گہوارۂ ظلمت کی فضا
اتنا تاریکی میں بھرنا کہ ضیا ہو جانا

(۱۹) (۵)

دل دے کے تو نے درد کے شایاں بنا دیا
اے عشق شکریہ مجھے انساں بنا دیا

فطرت کی اس بنائے غلط کی تلاش ہے
کیوں تیرا گھر قریب رگِ جاں بنا دیا

اس پر بھی اے اجل کبھی تو نے کیا ہے غور
کن صورتوں کو خوابِ پریشاں بنا دیا

اے شمع دل یہ ڈال کے ہم نے نقابِ یاس
تیرے لئے اک اور شبستاں بنا دیا

میں نے سرودِ جذبۂ دل چھیڑ کر ضیاؔ
سارے چمن کو آج غزلخواں بنا دیا

(۲۰) (۵)

جی چاہتا ہے روک دوں تخلیقِ انقلاب
جی چاہتا ہے بحر میں ٹھہرے رہیں حباب
تیرا ہر ایک سانس ہو تصویرِ دوست کی
اس شان سے ہو قصرِ محبت میں باریاب
جلوے فضا نواز ہیں آنکھیں کدھر گئیں
نغموں کی بارشیں ہیں کہاں کھو گئے رباب
جب سے نظر گری ہے شکستہ ہے سازِ دہر
جب تک نظر جوان تھی دنیا پہ تھا شباب
پیمانے اُڑ کے آئیں ضیاؔ تا بہ میکدہ
میکش ہوں بیقرار تو ہو موجزن شراب

(۲۱) (۵)

پھر وادیٔ خیال سے اپنا گذر ہے آج
اے دل نوید! دعوتِ ذوقِ نظر ہے آج
ہے کائناتِ عشق میں ہر چیز وجد خیز
وہ کیف ہے کہ بزم میں رقصاں شرر ہے آج
لے چل اُسی طرف مجھے اے ذوقِ سرخوشی
میری نشاطِ روح کا ساماں جدھر ہے آج
دوشیزگی میں ڈوب گئی پھر نظر مری
پھر عالمِ خیال میں رنگِ سحر ہے آج
اُٹھا ہے پھر فضا میں ضیاؔ ابر جھوم کر
وہ مستیاں کہاں ہیں جوانی کدھر ہے آج؟

(۲۲) (۱۷)

ہے نگاہوں میں مری جلوہ طرازِ نوروز
دامنِ صبح پہ پڑھتا ہوں نمازِ نوروز

نغمۂ عیش سے معمور ہوا اک عالم — ابھی چھیڑا بھی نہ تھا پردۂ سازِ نوروز
آفتاب آئینۂ ہستی کو سجاتا نکلا — ہر کرن بن گئی گیسوئے درازِ نوروز
تشنۂ بادۂ نو کب ہوں کہ ساقیٔ قدیم — ہے نئی شان سے جذبات نوازِ نوروز
عیشِ ظاہر سے مجھے کیف نہیں ہے تو نہ ہو — جذب ہے میری حقیقت میں مجازِ نوروز
ایک رشتہ سے وابستہ ہیں تاریکی و نور — شفقِ شام پہ ہوتی ہے نیازِ نوروز

درسِ تجدید ہے ہر صبحِ گلستاں کی ضیا
آہ سمجھی نہیں دنیا ابھی رازِ نوروز

(۲۳) (۸)

یوں خیالوں میں لگی گردشِ ایام سے آگ — کہ برسنے لگی ہستی کے در و بام سے آگ
لگ گئی بادہ ستاں میں غمِ ایام سے آگ — مانگتے رہ گئے میکش شفقِ جام سے آگ
سرد مہریٔ زمانہ سے نہ لرزے مہتاب — قرض لیجائے مرے شعلۂ الہام سے آگ
ذہن میں آتشیٔ طوفاں ہیں لاکھوں محفوظ — نہ بجھے گی جو لگے گی مرے پیغام سے آگ
مل گئی خاک میں رنگینیٔ آغازِ بہار — بھڑک اٹھی مرے اندیشۂ انجام سے آگ
ساز کے ساتھ ہوا سوز ودیعت مجھ کو — میں وہ میکش ہوں نکلتی ہے مرے جام سے آگ
باغباں کیوں ہے تجھے فکرِ چراغانِ چمن — چند جگنو ہی لگا دیں گے سرِ شام سے آگ

نور بخشا تھا جنھیں میرے تصور نے ضیا

(۲۴) آج اُن سینوں میں لگتی ہے مرے نام سے آگ (۶)

نہیں معلوم کیوں خاموش ہوں میں — خیالوں ہی میں کچھ مدہوش ہوں میں

الم ناکی کہاں طاری ہے مجھ پر — محبت میں مسرت کوش ہوں میں

کہاں ہوں میں خرابِ فکرِ امروز — کہ بدمستِ خمارِ دوش ہوں میں

مجھے ہے اعتراف اپنی خودی کا — بہت غافل بہت بیہوش ہوں میں

مجھی میں ہے جمالِ دوست پنہاں — تو کیا خود ہی تجلّی پوش ہوں میں

مجھے چھیڑے نہ چشمِ مستِ ساقی

(۲۵) ضیا اک بادۂ سرجوش ہوں میں (۱۷)

ہوا پر آشیاں احساس کا تعمیر کرتا ہوں — میں کیا کیا حفظِ محسوسات کی تدبیر کرتا ہوں

حقیقی زندگی ہے نام جذباتِ محبت کا — جنوں سے اپنے میں یہ مملکت تسخیر کرتا ہوں

کبھی گرنا، کبھی پھر ٹھوکریں کھا کر سنبھل جانا — میں اس اُفتاد کو بھی موت سے تعبیر کرتا ہوں

بنا لیتا ہوں آوارہ سری میں اک نیا عالم — مگر کچھ سوچ کر تعمیر میں تاخیر کرتا ہوں

جو لمحاتِ غم ساماں میں اپنے حال پر چھوڑو — میں ان لمحات میں اک زندگی تعمیر کرتا ہوں

کبھی میں یاس سے ویران کرتا ہوں تخیّل کو — تصوّر میں کبھی آرائشِ تصویر کرتا ہوں

ضیا روتا ہوں اکثر انتشارِ بزمِ ہستی پر

(۲۶) بیابانوں میں جا کر نالۂ دلگیر کرتا ہوں (۱۲)

کاہشیں جب نیند اڑ جانے کا ساماں ہو گئیں
کیسی کیسی چاندنی راتیں پریشاں ہو گئیں

چاندنیں چمکیں ستاروں میں نمایاں ہو گئیں
پھر ابھر آئیں وہ تصویریں جو پنہاں ہو گئیں

جب کبھی فطرت کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا
ساری دُنیا کی فضائیں گل بداماں ہو گئیں

خونچکاں جلتی تھیں دامانِ شفق کی سُرخیاں
صفحۂ گلشن پہ رنگ و بُو کا عنواں ہو گئیں

چاندنی سی میں نے پھیلا دی بساطِ دہر پر
محفلیں میرے تخیل سے درخشاں ہو گئیں

تھی نہ محتاجِ چراغانِ چمن شامِ بہار
جب شگوفے کھل گئے شمعیں فروزاں ہو گئیں

بزمِ ہستی بود خود اک اعتباری خواب ہے
بستیاں آباد ہی کب تھیں کہ ویراں ہو گئیں

دے گی طوفانِ حوادث کو وہ شاخیں کیا جواب
جب ہوا کے ایک جھونکے سے پریشاں ہو گئیں

فصلِ گل نے دفعتاً چھیڑا چمن میں اپنا ساز
رقص پھولوں نے کیا، کلیاں غزلخواں ہو گئیں

جانے کیا اپنی زباں میں کہہ گئی شامِ بہار
پھول مُرجھانے لگے افسردہ کلیاں ہو گئیں

چتونیں یہ فتنہ گر کافر، یہ آنکھیں الاماں
جیسے بُتخانے میں کچھ شمعیں فروزاں ہو گئیں

میں نہ تھا سرگشتۂ شمع و چراغاں اے ضیا
چند تاروں سے مری راتیں درخشاں ہو گئیں

(۲۷) (۹)

تجویز ہے کہ پھُونک دوں ہر گلستاں کو میں
طے کر رہا ہوں مسئلۂ آشیاں کو میں

پھرتا ہوں یوں نظر میں لئے آشیاں کو میں
پہچانتا نہیں ہوں ابھی گلستاں کو میں

صبحِ ازل سُنی تھی جو تیری زبان سے
دُہرا رہا ہوں آج تک اُس داستاں کو میں

پھر چاہتا ہوں جوش میں آئے رگِ وطن
شعلے پلا رہا ہوں ہر اک نوجواں کو میں

کیا جانے کون روک رہا ہے سجود سے
جُھک جُھک کے دیکھتا ہوں تِرے آستاں کو میں

پھر ہے مری نگاہ کو ذوقِ تجلیات
دینے چلا ہوں عمر میں حُسنِ جواں کو میں

منزل کو اہتمامِ چراغاں کا حکم دو
پہونچوں گا لیکے اوّلِ شب کارواں کو میں

ابتک ملی نہ منزلِ مقصود اے ضیا
کیا جانے چل پڑا تھا کہاں سے کہاں کو میں

(۲۸) (۵)

میں محوِ دید ہو کر حسرت مِٹا رہا ہوں
اُمید کی خیالی دُنیا بسا رہا ہوں

پُرشور ابر مجھ پر فطرت کے چھا رہے ہیں
میں دلمیں موجِ بصورت گنگا بہا رہا ہوں

یہ کون سُن رہا ہے میرا بہ دردِ اُلفت
حسرت بھری کہانی کِس کو سنا رہا ہوں

اب خار و گُل میں مجھ کو کیا امتیاز ہوگا
بیگانگی کے پردے سارے اُٹھا رہا ہوں

مہر و قمر ضیا ہیں میری ہی جلوہ گاہیں
ان آئینوں میں خود ہی میں جگمگا رہا ہوں

(۲۹) (۸)

کیوں کر گھر تک بزمِ ساقی سے چھلکتا جاؤں میں
اس تقاضا سے خود ہی کیوں ہوش میں آجاؤں نہیں

کس فضائے دلربا میں گم ہوئی ہستی مری
کاش اس گم گشتہ ہستی کا نشاں پا جاؤں میں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں گلشن میں مستی کی فضا
تا کہ اُس رنگیں فضا پہ مست پر چھا جاؤں میں

چاہتا ہے دل کہ یوں طے ہو مری عمرِ حیات
جادۂ عشق و محبت میں بھٹکتا جاؤں میں

جانتا ہوں فطرتاً انجامِ شورش ہے سکوں
پھر بھلا کیوں شورشِ عالم سے گھبرا جاؤں میں

باغ کی بنیاد نوکِ خار پر رکھتا تو ہوں
ہوشیاروں میں کہیں وحشی نہ سمجھا جاؤں میں

چاہتا ہے دل کہ جذبِ ابر ہو کر اُڑ چلوں
اور ویرانیٔ محفل پر برستا جاؤں میں

نور افگن پھر کوئی خورشیدِ نو ہو یا نہ ہو
اے ضیا دنیا کو اپنی ضو سے چمکا جاؤں میں

(۳۰) (۱۲)

کیا بتاؤں تجھ کو اپنے دل میں کیا رکھتا ہوں میں
درد میں ڈوبا ہوا اک ماجرا رکھتا ہوں میں

جس کے آگے قدسیوں کے کارواں ہوں سجدہ ریز
قلب میں وہ آیتِ مہر و وفا رکھتا ہوں میں

چھیڑتا ہوں سازِ اپنے سوز سے بعدِ بہار
کچھ شرارے دل میں تجلی کے چھپا رکھتا ہوں میں

میری ہستی میں جو گم ہے مجھ کو ہے اسکی تلاش
ایک ذوقِ جستجوئے صبح و مسا رکھتا ہوں میں

شکریہ اے دردمندِ عشق تیرا شکریہ
نقشِ سجدہ یادگارِ روشِ پا رکھتا ہوں میں

مجھ کو اپنے ساتھ آوارہ کر اے موجِ نسیم
شاخِ گل کو چومنے کا مدعا رکھتا ہوں میں

منتہائے زندگی ہے اک سکونِ مستقل
اور اپنے دل میں سو محشر بپا رکھتا ہوں میں

اس سے بہتر ترتیب دوں گا میں فنا کی کائنات
ایک مشتِ خاکِ دل بادِ صبا رکھتا ہوں میں

جب میں چاہوں گا جہاں کی روک دوں گا گردشیں
انقلابِ بزمِ ہستی کی دوا رکھتا ہوں میں

میری ہستی کا شناسا کوئی دنیا میں نہیں
سب کو اپنے راز سے ناآشنا رکھتا ہوں میں

اے ستارو خندہ زن ہونا نہ میری حال پر
چاند پنہاں سینکڑوں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں

اے ضیاؔ تیرہ کرے گی کس طرح گردِ مجاز
شیشۂ دل میں حقیقت کی ضیا رکھتا ہوں میں

(۳۱) (۹)

خستۂ بزمِ کائنات ہوں میں
تشنۂ چشمِ التفات ہوں میں

خود بخود ہو گیا اسیرِ گناہ
خود بخود مائلِ نجات ہوں میں

مجھے یوں جانتی ہے اک دنیا
جیسے دنیا کے دل کی بات ہوں میں

میرے ایامِ غم کی شدت دیکھ
دن نے مجھ سے کہا کہ رات ہوں میں

مجھے دشواریوں کا درس نہ دے
کہ ادا فہمِ ممکنات ہوں میں

نہیں ظاہر پرست میری نظر
فطرتاً محوِ حسنِ ذات ہوں میں

رخصت اے ضبط و صبر و استقلال
جانتا ہوں کہ بے ثبات ہوں میں

ہے خزاں میری بے نیازِ بہار
صبح جس کی نہ ہو وہ رات ہوں میں

میں کروں کیا ملاحظہ کہ ضیاؔ

(۳۲) خود جہانِ ملاحظات ہوں میں (۶)

عشق آزاد ہے دل عشق کا آزاد نہیں
سوز فطرت میں سہی جراءتِ فریاد نہیں

روز بن بن کے بگڑتے ہیں ہیولے دل کے
بستیاں کہنے کو آباد ہیں۔ آباد نہیں

میرے اجزا سے ہے تعمیر کلیسا و حرم
ایک ذرّہ بھی مری خاک کا برباد نہیں

زندگی کیا ہے؟ فقط ایک نشاطِ موہوم
کبھی اک خواب سا دیکھا تھا جواب یاد نہیں

کیا ہوئیں وہ مری راتوں کی بہاریں یارب
کیف آور سحرِ عالمِ ایجاد نہیں

ستم و جورِ حوادث کا ضیا شکوہ کیا
دل وہ پایا ہے جو آزردۂ بیداد نہیں

(۳۳) (۶)

یہ انقلاب یارب کیا آگیا چمن میں
گل خود ہی پھر رہے ہیں گلچیں کے پیرہن میں

رنگِ شفق کی شوخی دلچسپ دل رُبا ہے
کیا کیا ملاحتیں ہیں اس شام کی دُلہن میں

جگنو کی روشنی سے کلیوں کی تازگی سے
تارے چمک رہے ہیں پھولوں کی انجمن میں

اُلفت کے امتحاں میں نالہ نہ آئے لب تک
یہ درس دے رہا ہے پروانہ انجمن میں

آنکھوں سے شامِ غم میں آنسو بہا رہا تھا
دل مسکرا رہا تھا تاروں کی انجمن میں

روزِ ازل سے رنگِ فطرت ضیا نہ بدلا
سو انقلاب آئے دنیا کی انجمن میں

(۳۴) (۶)

آشنائے سوزِ الفت اے ضیاؔ جو دل نہیں گرمیِ محفل بنے، ہرگز وہ اس قابل نہیں
موت ہے امواجِ ہستی سے نکل جانے کا نام زندگی اک بحر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں
میری فطرت میں نہیں ہے اضطرابِ انتقام کیا کروں میری طبیعت اس طرف مائل نہیں
قلب کو تسکین ہے اب روح کو آرام ہے آج کوئی غم مری تقدیر میں شامل نہیں
دشتِ غربت میں بھٹکتا ہے یہ رستہ بھول کر کاروانِ عمرِ ہستی واقفِ منزل نہیں
قلبِ انساں میں ضیاؔ احساس ہونا چاہیے
جب ارادہ کر لیا مشکل کوئی مشکل نہیں

(۳۵) (۱۱)

آج اپنے دل سے پھر الجھا ہوں میں مدعا یہ ہے کہ دیکھوں کیا ہوں میں
روکنا اے مادیت کے حجاب خود بخود افشا ہوا جاتا ہوں میں
ہے مری آنکھوں میں کیفِ بے خودی خوابِ دوشیں سے ابھی جاگا ہوں میں
چاندنی راتوں میں جب اٹھتی ہے موج نور بن کر چاند میں بہتا ہوں میں
کس قدر رنگین ہے میرا مزاج صبح کے پھولوں کا گہوارہ ہوں میں
گلستاں میں چھیڑ کر غنچوں کے ساز خود بخود اک گیت گا لیتا ہوں میں
جادۂ ہستی ہے اک راہِ غلط یہ کہاں گم ہو کے آ پہنچا ہوں میں
دور تک کوئی نہیں ہے ہم خیال اس خراب آباد میں تنہا ہوں میں

کاروانِ زندگی آگے گیا ، پُر غبار اک صبح کا تارا ہوں میں
تنگ ہے مجھ پر فضائے کائنات ذرّے کی آغوش میں صحرا ہوں میں
زندگی کی بجھ گئیں شمعیں ضیا
تیرگیٔ شب کا پروانہ ہوں میں

(۳۶) (۱۱)

ہمارا ذکر کہاں آج گلستاں میں نہیں ہماری یاد تو ہے گو ہم آشیاں میں نہیں
نشانِ سجدہ کہیں سنگِ آستاں میں نہیں گمانِ ننگ مری سعیٔ رائیگاں میں نہیں
یہ غور کر کہ ہے کیا تیرے التفات کا رنگ نہ پوچھ یہ کہ اثر کیوں مری فغاں میں نہیں
جو کائنات میں اک زندگی سی پھیلا دے وہ سوز آج کسی سازِ نغمہ خواں میں نہیں
میں اس جہاں کی حدوں تک خرام فرما ہوں قیودِ گردشِ ایام جس جہاں میں نہیں
بہار کیا رگِ گل سے ابل رہی تھی شراب الٰہی کیوں وہ فضا آج گلستاں میں نہیں
کنارِ خاک میں جلوے بہت ہیں خوابیدہ زمیں میں ہیں وہ ستارے جو آسماں میں نہیں
تصوّرات نے توڑا طلسمِ منزلِ دوست یہ بیخودی ہے کہ اب کوئی درمیاں میں نہیں
ہمارے دل سے نکلتا ہے بے خودی میں کبھی وہ ایک نغمہ جو ناقوس اور اذاں میں نہیں
اسی طرح گذران ہے یہ کاروانِ چمن جو کل قفس میں نہ تھی آج آشیاں میں نہیں
میں کارواں سے الگ ہو کے چل رہا ہوں ضیا

(۳۷) مذاق فہم مرا کوئی کارواں میں نہیں (۷)

نہ پہلو میں دل ہے نہ دلداریاں ہیں
مجھے بارِ غم سے سبکباریاں ہیں

محبت ہی اُن کا ہے درمانِ واحد
زمانے کو لاحق جو بیماریاں ہیں

سحر تک فروزاں ہیں تاروں کی شمعیں
کسی خیر مقدم کی تیاریاں ہیں

وہی بے خودی ہے اسیرِ محبت
وہی ہوش والوں کی بیزاریاں ہیں

جو ڈوبے تھے جذباتِ آغوشِ شب میں
اُفق سے پھر ان کی نموداریاں ہیں

وہ تا صبح تاروں سے خاموش باتیں
کہاں میری اُن کی بیداریاں ہیں!

ضیا جگنوؤں کا نشیمن بنا ہوں
گریبانِ وحشت میں چنگاریاں ہیں

(۳۸) (۹)

وہ جلوہ گاہ کہاں، میں شکستہ حال کہاں
یہ لے چلی ہے مجھے حسرتِ جمال کہاں

زہے نصیب، گنہگار ہوں محبت کا
مجھے ہے ناز گناہوں پہ، انفعال کہاں

سکون موت ہے، یہ تو میں جانتا ہوں مگر
سکونِ دل کا محبت میں احتمال کہاں

نہیں ہے حدِ نظر تک بھی ماسوا کا پتہ
یہ آج لائی مجھے وحشتِ خیال کہاں

ہنوز چاہیے اک عمر گھل کے مرنے کو
غمِ مآل سلامت، ابھی مآل کہاں

ترے جلال کا اک شعلہ ہے فسانۂ طور
ابھی اُٹھا ہے سراپردۂ جمال کہاں

اسیرِ شوق ہوں کانٹوں سے راہ کے کیا کام   اُلجھ گیا یہ مرا دامنِ خیال کہاں

نہ رہگذر ہے نہ محفل نہ آستاں نہ حرم   مذاقِ دل نے کیا مجھ کو پائمال کہاں

ضیاؔ ہوس میں محبّت میں امتیاز رہے
جو اہلِ دل ہیں وہ سرگشتۂ وصال کہاں

(۳۹)   (۹)

شمع ہے بے نور محوِ رقصِ پروانہ نہیں   گرم کیا محفل میں کوئی آج افسانہ نہیں

شاکیِ ظلمت خزاں میں میرا ویرانہ نہیں   داغِ دل تو ہے جو تجلیِ شمع کاشانہ نہیں

تجھ پہ واضح کر رہی ہیں شورشیں اپنا مآل   آئینہ ہے محفلِ ہستی کا، ویرانہ نہیں

جس کا دل ویراں ہو در اصل دیوانہ ہے وہ   جو ہو ویرانوں میں آوارہ وہ دیوانہ نہیں

رات دن فطرت کی موجیں ہیں مسلسل رقص میں   حسن ہو یا عشق ہو پابندِ افسانہ نہیں

اے جنوں اب کے مجھے باغِ وطن میں قید کر   لوگ کہتے ہیں یہ آزادی کا دیوانہ نہیں

بھول جاتا ہے زمانہ ہر گزشتہ انقلاب   اور کیا ہے شورشِ ہستی جو افسانہ نہیں

عشق کیا ہے حسن ہی کی اک ادائے مضطرب   شمع ہی کا عکسِ لرزاں ہے یہ پروانہ نہیں

رات پیغامِ سحر ہے اہلِ باطن کو ضیاؔ
جو اندھیرے میں بھٹک جائے وہ پروانہ نہیں

(۴۰)   (۷)

فلک نشیں ہیں انھیں آستاں نشینوں میں   نشان سجدوں کے محفوظ ہیں جبینوں میں

گدازِ شمع نہیں اہلِ بزم میں تقسیم
یہ اک کمی ہے محبت ترے قرینوں میں

انھیں میں جذب ہے طوفانِ اشکِ غم میرا
چراغِ طور فروزاں ہے آستینوں میں

گزر گئے وہ مقاماتِ غزنوی و ایاز
نظر میں ساز نہ اب ہے گداز سینوں میں

اُسے ڈرائے گا کیوں کر مآلِ طوفاں کا
جو پرورش کرے طوفاں کی سفینوں میں

تجھے یہ وہم کہ شہرت کا آسماں ہوں میں
مجھے یہ فکر، نہیں ہیں کہیں زمینوں میں

ضیاؔ تجاوزِ افکار نے تباہ کیا
اُمنگ اٹھتی ہے لیکن کبھی مہینوں میں

(۴۱) (۹)

عجیب تیرگیوں میں گھرا ہوا ہوں میں
ضیا کی فکر میں ہوں اور خود ضیا ہوں میں

یہ حوصلہ ہے کہ غم سے شکست دوں غم کو
یہ مشغلہ ہے کہ جذبوں سے کھیلتا ہوں میں

جنھیں نوازشِ ذوقِ وفا سے ہے پرہیز
انھیں کنارِ تصوّر میں دیکھتا ہوں میں

مرے خیال کی رفعت پہ اعتبار کرو
حریمِ عرش کو بے پردہ چھو رہا ہوں میں

بقا ہی میری ہے میرے حدوث کی ضامن
ہر ایک سانس میں آمادۂ فنا ہوں میں

قیودِ کون و مکاں سے غرض نہیں مجھ کو
کہ لامکاں سے بھی آگے نکل چکا ہوں میں

مجھے بہار کی جلوت میں ڈھونڈنے والو
سنو کہ خلوتِ بے رنگ میں پڑا ہوں میں

کہو کہ دونوں جہاں گوش بر صدا ہو جائیں
کہ ساز چھیڑ کے پھر کچھ سنا رہا ہوں میں

کسی کا شوق لئے جا رہا ہے مجھ کو ضیا
کسی کے شوق میں خود رفتہ جا رہا ہوں میں

(۴۲) (۹)

بے حسی اتنی ہے غالب فکرِ فردا کچھ نہیں
تیرگیٔ شام کا انجام گویا کچھ نہیں

جھوم کر اُٹھنا برسنا اور گرنا خاک پر
میری ہستی ابرِ باراں سے زیادہ کچھ نہیں

منظرِ عالم سے رہتی ہیں نگاہیں بے نیاز
کیوں ہوا احساسِ تماشا جب تماشا کچھ نہیں

چاہتا ہوں یہ کہ ہر شے پر ہو میرا اختیار
جانتا ہوں یہ کہ اس دنیا میں میرا کچھ نہیں

بھول جاتا ہوں میں اکثر واقعاتِ زندگی
خواب ہیں نظروں میں دنیا یعنی دنیا کچھ نہیں

دل کو وسعت دی کہ برپا اس میں ہو طوفانِ غم
جذب اگر کر لے نہ دریا کو تو قطرا کچھ نہیں

یہ تماشہ گاہِ عالم کیا تماشا گاہ تھی
صبح سے تا شام جاگے اور دیکھا کچھ نہیں

ذرے ہی ذرے سے یہ اپنے کاروں اپید اکرے
ورنہ اک سنسان ویرانہ ہے صحرا کچھ نہیں

اے ضیا ہر ساز کی آواز پر بدمست ہوں
ایک نغمے کے سوا ہستی کا نشا کچھ نہیں

(۴۳) (۹)

محفلِ ہستی کو نالوں سے تہ و بالا کریں
آج دردِ زندگی اس شان سے افشا کریں

دیکھنے والے نگاہِ شوق سے دیکھا کریں

ساز جب جوں کا چھڑتا ہے تو یاد آتے ہیں گیت
بحرِ طوفاں خیز کی امواج پر گاتے ہیں گیت

ہم ہیں طوفاں آشنا ارمانِ ساحل کیا کریں

میرا ملنا ہی بہت دشوار خود عنقا ہوں میں — درد بن کر زندگی کے دل میں گم رہتا ہوں میں

ڈھونڈنے والوں سے کہدو پردۂ دل وا کریں

عشق کا پیغام بزمِ حسن سے لایا ہے درد — بعدِ مدت آج اپنے دل میں پھر اٹھا ہی درد

رازدارِ غم بتا اس درد کا اب کیا کریں؟

محفلِ انسانیت میں صبح سے ہی شام ہے — ساری دنیا ارتقائے بزم میں ناکام ہے

یہ ارادہ ہے کہ اب اس کام کو تنہا کریں

ذہنِ آشفتہ ہے پھر تجدید کے ارمان ہیں — جھونک دیں اس غم کدے کو موت کے طوفان میں

پھر نئی ترتیب سے دنیا نئی پیدا کریں

ہیں خودی کے حائلے تیری نظر کے سامنے — کیا یہ سجدے کر رہا ہے بام و در کے سامنے

آشنائے خود ہو کہ تجھ کو بام و در سجدا کریں

کند ہے ذہنِ طریقت فکر بھی گھبرا چکی — ہو چکا ناکام مذہب عقل ٹھوکر کھا چکی

آؤ اب اپنے تصور سے خدا پیدا کریں

بیخودی ہے سر خوشی کی موج میں بہنے کا نام — زندگی ہے اے ضیا اک داستاں کہنے کا نام

(۴۴) داستاں کہتے رہیں ہم اہلِ دل جھوما کریں (۴)

ہجومِ انجمن میں داستانِ غم بیاں کیوں ہو
ہمارے دل میں جو اک راز ہے وہ داستاں کیوں ہو

نشیمن پھک چکا ہے صرف اسکی یاد باقی ہے
پھر اب بربادیوں کے بعد کوئی مہرباں کیوں ہو

مری نغماتِ غم بکھرے ہوئے ہیں سارے گلشن میں
وگرنہ پتے پتے کی زباں پر داستاں کیوں ہو

حریمِ گل کے اسرار اور پھر انکی یہ رسوائی
ہوا ہے گل بہاروں میں ضیاؔ افسانہ خواں کیوں ہو

(۴۵) (۹)

عظمت دی ہے میں نے اپنے ہاتھوں سے ویرانوں کو
اپنی ایک نظر سے میں نے ڈھایا ہے ایوانوں کو

دعوتِ جذبِ کیف کی ساقی آج تو دے مستانوں کو
اپنی مست نگاہوں سے لا گردش میں پیمانوں کو

چپکے چپکے دن بھر آنسو چند فسانے کہتے ہیں
رات کو تارے سر دھنتے ہیں سنکر ان فسانوں کو

صرف انکی آزادروی سے سازِ عالم برہم ہے
رقصِ جنوں آتا تو کبھی سمجھا دیتا دیوانوں کو

دنیا ایک طلسمِ کہنہ تیری نظریں آوارہ
ناداں تو کیا سمجھے گا ان دھوکے کے سامانوں کو

در پردہ انسانیت کی فطرت نے رسوائی کی
وحشی بنکر لوٹ لیا انسانوں نے انسانوں کو

اتنے ہشیاروں میں کوئی کر نہ سکا تفسیرِ وفا
کھینچ کے لائی ہیں مشکل سے محشر میں دیوانوں کو

نازک نازک صبح ہوا کی حسن کدوں سے وقتِ سحر
دھیرے دھیرے آئی جگانے سوئے ہوئے ارمانوں کو

پی گئے آنسو غم کے ہنس کر ضبط کیا نالوں کو ضیاؔ
موجِ تبسم میں ہم نے یوں جذب کیا طوفانوں کو

(۴۶) (۵)

سمجھ کے بزمِ حقیقت کا ترجماں مجھ کو — بنا لیا غمِ ہستی نے رازداں مجھ کو

لبِ خموش سے اسرارِ عشق فاش نہ ہوں — اسی لئے تو ملا ہے غمِ نہاں مجھ کو

چمن کے ربط و تعلق سے ہو نہ مایوسی — الٰہی ڈھونڈتا پھرتا ہو آشیاں مجھ کو

نیاز کی ہے ضرورت نہ زحمتِ سجدہ — دیا ہے بے خبری نے وہ آستاں مجھ کو

ضیا فضاؤں کو بدلا ہے گردشیں دیکر
زمانہ پھر نظر آنے لگا جواں مجھ کو

(۴۷) (۵)

رفتہ رفتہ ہوئی غم کھانے کی عادت مجھ کو — بارِ خاطر رہی کچھ روز محبت مجھ کو

آج پھر وادیٔ کہسار میں لیکر پہونچی — غم پسندی و المنا کیٔ فطرت مجھ کو

آج انگڑائی پہ انگڑائی چلی آتی ہے — کر رہا ہے کوئی مجبورِ محبت مجھ کو

ہے تپش بھی مری فطرت میں گل افشانی بھی — ساز کے ساتھ ہوا سوز ودیعت مجھ کو

آئینہ خانے سے تسکین نہیں ہو سکتی
نظر آتی ہے ضیا اپنی ہی صورت مجھ کو

(۴۸) (۶)

زندگانی اک سراب اک وہم تھی منزل نہ تھی — میری کشتی عمر بھر آسودۂ ساحل نہ تھی

آج شاعر اپنی عظمت کا علم بردار ہے — اس سے پہلے شاعری اس چیز کی حامل نہ تھی

ہوتے کیوں مایوس ہمت ہار کر کیوں بیٹھتے — ناامیدی جادۂ امید کا حاصل نہ تھی

ذرّہ ذرّہ دے رہا ہے درسِ بیداری تجھے　　اب سے پہلے اسقدر غافل تری محفل نہ تھی
میرے استقلال و پامردی کے جوہر دیکھنا　　حوصلہ جب بڑھ گیا مشکل کوئی مشکل نہ تھی
میں نے گلشن میں لگادی آگ اپنے سوز سے　　یہ مرے دل کی صدا تھی شورشِ باطل نہ تھی
اے ضیا جب عزم کو میں نے مصمم کرلیا
پھر کوئی شے سنگ بنکر راہ میں حائل نہ تھی

(۴۹)　　(۷)

مرے ذوقِ نظر کی تشنہ سامانی نہیں جاتی　　ابھی فطرت کے جلووں کی فراوانی نہیں جاتی
کبھی آغوشِ گل میں ہوں کبھی تاروں کی محفل میں　　نگاہِ شوق کی آوارہ سامانی نہیں جاتی
وہاں میں عالمِ حیرت کو طے کرکے پہونچتا ہوں　　جہاں بے اذن حیرانوں کی حیرانی نہیں جاتی
ضیا نظارۂ فطرت کی دعوتِ عام ہے مجھ کو
مگر اب بھی مری سر در گریبانی نہیں جاتی

(۵۰)　　(۸)

آہ یہ دنیا کہ اپنے غم میں چلّاتی رہی　　آہ وہ فطرت کہ ظالم عمر بھر بہری رہی
اڑ کے شاخِ گل سے جگنو کہکشاں بنتے رہے　　اور شاخِ گل سے تاروں کی نمو جاری رہی
حال ہے تاریک اپنا اور مستقبل تباہ　　زندگی کیا جب نشاطِ زندگی جاتی رہی
لے گیا اپنی متاعِ زندگی غم لوٹ کر　　اور یہ دنیا یونہی تسکین فرماتی رہی
رات بھر آرام سے سویا کیا بختِ سیاہ　　یاس اور امید میں اک کشمکش ہوتی رہی

فطرتاً مربوط ہیں دونوں سکون و اضطراب
زندگی بھر موج ساحل سے گلے ملتی رہی
نوحہ خوانی کر کہ اب وہ آس بھی باقی نہیں
پھوڑ لے آنکھیں کہ قسمت آج بھی اندھی رہی
میں نے سوچا تھا کروں گا زندگی پر نازشیں
زندگی نے پھیر لیں نظریں ضیاؔ اچھی رہی

(۵۱) (۵)

نغمۂ نو سے بڑھا دے التہابِ زندگی
تشنۂ مضراب ہے میرا ربابِ زندگی
پھر ہی صحرا نوردی پھر ہی جوشِ جنوں
خار و گل میں بھی نظر آیا شبابِ زندگی
دیکھیے جذبات کی بارش کا کیا انجام ہو
دیکھیے کیا رنگ لاتا ہے سحابِ زندگی
کیوں نہ ہم شیرازہ ہستی سے کوئی کام لیں
ہوں پریشاں جبتک اجزائے کتابِ زندگی
کاروانِ صبح کی مہماں سرا ہے بزمِ شب
زندگی ہے اے ضیاؔ تعبیر خوابِ زندگی

(۵۲) (۱۰)

انساں نے فکرِ سیر میں جو اختیار کی
دُنیا بھی اک کڑی ہے اسی رہگزار کی
پھر زینتِ نگاہ ہے تصویرِ حسنِ دوست
تکمیل بیخودی ہو تو باتیں ہوں پیار کی
یا رب دل کو چین نہ ہی روح کو سکون
انساں بنا کے بخشدی فطرت شرار کی
جس شخص کے نصیب میں ہو نہ خود کشی
اس کو ملے خدا سے سزا انتظار کی
ہم نے تو اپنی خاک کو آوارہ کر دیا
اب کس کو احتیاج ہے موجِ بہار کی

بیٹھے تو ہم نے بزم کو پھولوں سے بھر دیا
اُٹھے تو اک نگاہ تھے برق شرار کی

سینچا ہے باغباں نے جسے اپنے خون سے
میں آخری بہار ہوں اس لالہ زار کی

میں شہپرِ نسیم پر آیا ہوں باغ میں
مجھکو اڑا کے لائی ہے موجِ بہار کی

تاری ہے خامشی ہے تصور ہے اور میں
کس طرح جاوداں ہو یہ ساعت قرار کی

پھر کوئی انقلابِ جدید آئے گا ضیا
بدلی ہوئی سی ہیں روشیں روزگار کی

(۵۳) (۷)

جو شکل کہیں دیکھی وہ دل میں اُتر آئی
اللہ رے نظروں کی بے ساختہ گیرائی

ہر ذرہ ہستی ہے جلووں کا تماشائی
اے چشمِ تمنائی تو مجھ کو کہاں لائی؟

نظروں میں چھلکتے ہیں جھکے ہوئے میخانے
یہ تو نے کدھر دیکھا اے چشمِ تماشائی

تسکینِ طبیعت کی فطرت سے دعا کی تھی
اک موجِ نفس اُٹھی اور غم کو اُٹھا لائی

پہونچے گی خدا جانے دنیا کو کہاں لے کر
ظاہر کی خدا ترسی باطن کی خود آرائی

تاروں سے کہو تھامیں مہتاب کا پیمانہ
میں کسل سے تنگ آ کر لیتا ہوں اک انگڑائی

نغمے ہیں ضیا میرے سیلاب خموشی کا
کہتا ہوں غزل لیکن حاصل نہیں گویائی

(۵۴) (۶)

بن کے بادہ رنگ ہونٹوں سے کچھ افسانہ چلے
پھول اُڑانے کو بھری محفل میں پیمانے چلے

مژدہ باد اے فضائے دلکش و ابرِ بہار
پھر ہم اپنے ذہن میں تازہ کیف برسانے چلے

ہر قدم پر سجدہ کرنے خود ہی منزل آ گئی
بیخودی کے کیف میں رقصاں جو مستانے چلے

آخر آخر میں ہی پہونچا بزمِ سوز و ساز تک
مست اک منزل چلے، کچھ دور دیوانے چلے

سرخوش و پُر شور و رقصاں نغمہ خوان و نغمہ ریز
بادلوں میں کہاں چُھپ چُھپ کے میخانے چلے

کچھ بڑھا دی ظرفِ امانِ چمن گلچیں کہ ہم
گیت گلشن میں زبانِ حال سے گانے چلے

ہو گئی برہم نگاہِ ساقیہ تو اے ضیاؔ
میکدے میں خوب شیشے اور پیمانے چلے

(۵۵) (۱۰)

نہیں گونجا اذانِ دل کیوں پر نہ برسوں سے
کہاں کھویا ہوا ہے وہ مرا دیوانہ برسوں سے

حدیثِ شوق پھر بھی تشنۂ تکمیل ہے اب تک
محبت کر رہی ہے کاوشِ افسانہ برسوں سے

مری آمد نے موجِ مے میں تازہ لہر دوڑا دی
مجھی کو تک رہا تھا ساقیِ میخانہ برسوں سے

بالآخر حُسن کے پیکر میں گنجائش ملی اس کو
سجائی جا رہی تھی فطرتِ گل خانہ برسوں سے

حوادث کر چکے ہیں سرد دل کی شعلہ سامانی
میسر ہی نہیں ہے گرمیِ کاشانہ برسوں سے

یہ سوچا ہے رہِ اُلفت میں اس کو رہنما کر لیں
کہ ہے مصروفِ مشقِ ضبطِ غم پروانہ برسوں سے

ہوائے دشت میں ہے قوتِ تخلیقِ افسانہ
بگولے لے رہے ہیں دعوتِ ویرانہ برسوں سے

ہے بزمِ کہکشاں تک والہانہ دسترس میری
ستارے توڑ کر لاتا ہوں آزادانہ برسوں سے

برہمن کے تصوّر میں کوئی رنگیں پجارن ہے — بڑھائی جا رہی ہے زینتِ بتخانہ برسوں سے
جمود و بےحسی طاری ہے دل پر تیں گزریں
نہیں آیا ہے گردش میں ضیاؔ پیمانہ برسوں سے

(۵۶) (۶)

جب کوئی ہم کلام ہوتا ہے — ذوقِ تشنہ تمام ہوتا ہے
بنتے ہیں بزم میں جب افسانے — وہ بھی کیا انتظام ہوتا ہے
میں تو ساقی اُسے بناتا ہوں — جس کی آنکھوں میں جام ہوتا ہے
نہیں ملتی شرابِ شوقِ جہاں — دل وہیں تشنہ کام ہوتا ہے
جب تصوّر میں کچھ نہیں ہوتا — مجھ کو سجدہ حرام ہوتا ہے
دل میں اُٹھتا ہے جب دھواں سا ضیاؔ
صبح میں رنگِ شام ہوتا ہے

(۵۷) (۱۱)

مختصر سی زندگی میں کوئی کیا پیدا کرے — ذوقِ ترکِ مدعا یا مدعا پیدا کرے
فصلِ گل ہی چھیڑ دے بادِ صبا غنچوں کے ساز — گلستاں میں گیت گانے کی فضا پیدا کرے
گر یوں ہی دنیا رہے میرے لئے تسکین خیز — کیوں نہ ہر دم شوق اک نغمہ نیا پیدا کرے
ضبط کی گرمی سے غنچوں کے پھٹے جاتے ہیں دل — رازِ گلشن کوئی اپنا آشنا پیدا کرے
چاند سے کہہ دو کہ تاروں کو دے اذنِ خرام — خامشیِ شب میں پھر بانگِ درا پیدا کرے

چھیڑ وہ افسانۂ رنگیں لبِ خاموش سے
جو تبسم کے شگوفوں سے نوا پیدا کرے

بندۂ دیر و حرم ہو بندشوں سے بے نیاز
پھر تصور کے ہیولوں سے خدا پیدا کرے

دل کے قابو میں اگر ہو کوششِ تجدیدِ دہر
اپنی دنیا ساری دنیا سے جدا پیدا کرے

خلقتِ انساں کا جزوِ خاص ہیں مجبوریاں
جو فنا پر بھی نہ قادر ہو وہ کیا پیدا کرے

کر رہی ہے یوں شبابِ گلستاں پیدا بہار
شعر جیسے شاعرِ رنگیں نوا پیدا کرے

ابرِ پیغام جوانی لے کے اٹھا ہے ضیا
کوئی دل کی تیرگی میں پھر ضیا پیدا کرے

(۵۸) (۵)

آنسو نہیں اک شمع مصیبت کے لئے ہے
تارا یہ فروغِ شبِ غربت کے لئے ہے

پھر چشمِ تصور میں فروزاں ہوئیں شمعیں
گویا کہ یہ تمہید مسرت کے لئے ہے

سنتا ہوں پھر اٹھا ہے گرجتا ہوا بادل
شاید یہی موقع مری وحشت کے لئے ہے

یہ کہہ کے پیا میں نے جوانی کا بھرا جام
یہ جام مرا عشق و محبت کے لئے ہے

یہ سوچتا رہتا ہوں ضیا زندگی میری
ماتم کے لئے ہے کہ مسرت کے لئے ہے؟

(۵۹) (۸)

اے راہگیرِ ہستی تو کیوں رواں دواں ہے
بھٹکے ہوئے مسافر منزل تری کہاں ہے؟

دنیا تو پوجتی ہے پندار کے بتوں کو
اے بیخودی بتا دے میرا خدا کہاں ہے؟

لیکر چلا ہوں اپنی ٹوٹی ہوئی سی کشتی
طوفانِ زندگی ہے ، کمزور بادباں ہے

جس دن سے میں نے رسمی پیمانے توڑ ڈالے
میخانۂ تصوّر اس دن سے لامکاں ہے

لایا تھا عشق اپنا سازِ خودی اٹھاکر
اب حُسن خندہ زن ہے اور وہ ہی کہاں ہے

میں سازِ زندگی کا اک گیت بن گیا ہوں
بربط ہے زندگی کا اور میری داستاں ہے

مدت ہوئی ہے دل نے نغمے نہیں سُنے ہیں
اے مطربِ محبت آواز دے کہاں ہے

بجلی چمک چمک کر رستہ بتا رہی ہے
تاریک بادلوں میں شاید ضیا نہاں ہے

(۶۰) (۱۰)

جانے والے جاتے جاتے کہہ گئے
ہم چلے اور باغ سونے رہ گئے

سننے والے دل سنبھالے رہ گئے
کہنے والے اپنی اپنی کہہ گئے

نو اسیرانِ قفس کا ظرف دیکھ
فصلِ گُل کی تازگی کو سہہ گئے

ناخدائی ناخدا کرتا رہا
بہنے والے اپنی رَو میں بہہ گئے

محفلِ ہستی میں تھا اتنا قیام
آئے بیٹھے کچھ سُنا کچھ کہہ گئے

گر پڑے دامن پہ کچھ آنسو مرے
کچھ نگاہِ یاس بن کر رہ گئے

کون طوفاں کا کرتا انتظار
ہم خود اپنے آنسوؤں میں بہہ گئے

میں ہوا تنہا ہی منزل آشنا
قافلے والے بھٹکتے رہ گئے

سازِ پر غنچوں کے گایا کس نے گیت نغمے پھولوں میں اُلجھ کر رہ گئے
وہ بھی کیا جلوے تھے فطرت کے ضیا
جو نگاہِ شوق بن کر رہ گئے

(۶۱) (۱۰)

جو برقِ سرِ طور مشہور ہے وہ جلوہ مرے دل میں مستور ہے
جو ہے نشۂ عشق میں چور ہے یہ کیا بزمِ ہستی کا دستور ہے
اسے ذرّے ذرّے پہ ہے اختیار مگر پھر بھی انسان مجبور ہے
بنا دو مجھے سر بسر اضطراب اگر میری تسکین منظور ہے
یہ امن کی جنبش یہ حسنِ خرام ہر اک ذرۂ خاک مغرور ہے
تھکا جا رہا ہے مرا ذوقِ سیر ستاروں کی محفل بہت دور ہے
کدھر کا ارادہ ہے اے بیکسی؟ قفس پاس ہے آشیاں دور ہے
کلیمِ محبت ہے ہر عندلیب ہر اک پھول چھوٹا سا اک طور ہے
ابھی گم نہیں میں اے بیخودی ابھی میری منزل بہت دور ہے
میں ہوں نورِ ایوانِ ہستی ضیا
جہاں میرے جلووں سے معمور ہے

(۶۲) (۹)

فطرتِ ناز و نیازِ آدمی دیکھا کیے بیخودی میں بھی ہم آثارِ خودی دیکھا کیے

لگ اٹھی اک آگ گلچیں کی نگاہِ گرم سے
پھول گلشن میں مآلِ تازگی دیکھا کیے

تیرگی میں بھی کرن امید کی تاباں رہی
شامِ غم چنگاریاں اڑتی ہوئی دیکھا کیے

خامشی میں حکمرانی کی ہمیں قوت ملی
ضبط کی گرمی سے پیدا برہمی دیکھا کیے

تھی غرض اک خوشنما دھوکا بساطِ دہر کا
دوست اس پردے میں رنگِ دوستی دیکھا کیے

شورشوں ہی میں نہاں تھا انتظامِ زندگی
اضطرابِ موج میں تسکین سی دیکھا کیے

کچھ نہ بولے عالمِ غم میں زمین و آسماں
خامشی سے عشق کی آزردگی دیکھا کیے

تو نے اے ساقی نہ دیکھا خشک ہونٹوں کی طرف
تیرے پیمانے مری تشنہ لبی دیکھا کیے

تھا قفس ہی آشیاں اپنا پسندی کچھ نہ پوچھ
دھوپ میں بھی اے ضیا ہم چاندنی دیکھا کیے

(۶۳) (۴)

اپنے سجدے وقف ہیں اک آستانے کے لئے
ہے ابھی موقع مقدر آزمانے کے لئے

ایک مشتِ خاک سے دنیا کو ہے اتنا غبار
آندھیاں اٹھتی ہیں میری خاک اڑانے کے لئے

نالہ کیوں کھینچوں حریمِ دوست تیرے ناز پر
اک نظر کافی ہے سو پردے اٹھانے کے لئے

خندۂ گل صبحدم کیوں ہو گیا حائل ضیا
غنچے کو فرصت ملی تھی مسکرانے کے لئے

(۶۴) (۹)

کہدو کہ آج ستیاں آئی گھٹا لئے ہوئے
تازگیٔ نشاط ہے موجِ ہوا لئے ہوئے

نغمۂ و چنگ کی صدا محشرِ وجد و کیف ہے — رقص میں ہے فضائے حسن رنگ نیا لیے ہوئے
منزلِ عشق میں مجھے حاجتِ رہنما نہیں — ہے مرا کاروانِ شوق جرسِ درا لیے ہوئے
ساقیۂ نظر فریب ہے پئے رفعِ دل شکیب — بادہ فروش سانس میں بوئے وفا لیے ہوئے
آج شباب مست ہے محفلِ حسن و عشق میں — وقتِ خرام حیلۂ لغزشِ پا لیے ہوئے
گرمیٔ انجمن ہوں میں آتشِ ہر چمن ہوں میں — ہر نفسِ خموش میں ساز و نوا لیے ہوئے
کاوشِ غم نہ کیوں ہو کم آ گیا حسنِ شامِ غم — دوشِ حسیں پہ گیسوئے عقدہ کشا لیے ہوئے
خلوتِ تیرہ و تار میں بھر دیں یہ کس نے بجلیاں — سامنے آ گیا یہ کون آئینہ سا لیے ہوئے

چھائی ہوئی ہے بیخودی مجھ پہ کمالِ ذوق کی
اک دلِ درد آشنا ہوں میں ضیا لیے ہوئے

(۶۵) (۹)

زمانہ خود مری محرومیوں پہ ناز کرے — خدائے عشق مری عمرِ غم دراز کرے
میں ایک نغمۂ جاوید لے کے آیا ہوں — مغنیہ سے کہو انتظامِ ساز کرے
بقائے جزو وہی جب کل میں جذب ہو جانا — پیامِ مہر سے کیوں شبنم احتراز کرے
پلٹ دی محفلِ ہستی کو زلزلے دیکر — جو چاہے شعبدۂ چشمِ نیم باز کرے
جو راز بن کے ہو خود جانِ پردۂ اسرار — وہ کیا ملاحظۂ پردہ ہائے راز کرے
مذاقِ عشق وہ ضابطہ سکھا دی مجھ کو — جو ساری عمر طوافِ حریمِ ناز کرے

جسے مذاقِ حقیقت کی تشنگی ہے ہنوز
وہ آئے بیعتِ میخانۂ مجاز کرے

مری نظر ہی سے کھیلے محبتِ معصوم
مجھی سے چھیڑ نہ کیوں حسنِ دلنواز کرے

ضیاؔ نیاز میں ہے فرشِ خاک زانوئے دوست
وہ دل ہی کیا جو محبت میں امتیاز کرے

(۶۶) (۷)

وہ کونسا رستہ ہے ایسا جھلک کسی کی جہاں نہیں ہے
یہ حسن کا نقشِ رہگذر ہے یہ جادۂ کہکشاں نہیں ہے

چمن میں اور نہر کے کنارے نہ ہیں جگنو نہ ہیں ستارے
یہ میری نطق کے شرارے بہار کا کارواں نہیں ہے

زوال کیا انحطاط کیسا جمال ہے رنگِ مستقل میں
یہ اوج سیرِ خیال کا ہے یہ چاند کا آسماں نہیں ہے

نمازِ عفوِ گنہ ہے ساقی تو کیوں نہ پہلے گناہ کر لیں
ابھی تو دو جام اور پی لیں ابھی تو وقتِ اذاں نہیں ہے

یہ ہم ہی اور یہ فتنہ کاری میں اس نظارے سے باز آیا
یہ شورشِ انجمن سے کہہ دو کہ مجھ کو جینا گراں نہیں ہے

تری صدا نے تو اے مغنی کچھ اور بے کیفیاں بڑھا دیں
ربابِ اے ہرلا خموش ہو جا کہ تیرا نغمہ جواں نہیں ہے

ضیاؔ یہ چرخِ کہن ہمارا زمیں ہماری زمن ہمارا
ہمارا جنگل چمن ہمارا وطن ہمارا کہاں نہیں ہے

(۶۷) (۹)

یہ کائنات مری رازداں نہ ہو جائے
متاعِ عشق کہیں رائیگاں نہ ہو جائے

سوادِ شام کی پھر بڑھ رہی ہے تاریکی
یہیں غروب مرا کارواں نہ ہو جائے

یہ جوشِ ابر یہ تاریکیاں یہ سناٹا
شبِ بہار بھی دل پر گراں نہ ہو جائے

مری وفائے محبت کی قدر کر اے دوست خدائے حسن و وفا بدگماں نہ ہو جائے
مغنیہ ترے نغموں کا کیف ذرا عالم! سنبھل سنبھل کہیں دنیا جواں نہ ہو جائے
ہر ایک ذرہ کو ہے فکرِ عظمتِ خورشید زمیں بھی آخرِ کار آسماں نہ ہو جائے
لگا دے آگ مرا سوز سازِ ہستی میں سرودِ ابر اگر نغمہ خواں نہ ہو جائے
شکستہ دل ہو مری روح کو سہارا دے دعا ہی دستِ طلب پہ گراں نہ ہو جائے
ضیا یہ سلسلۂ جام و بادہ ختم کرو
(۶۸) حریمِ دوست میں وقتِ اذاں نہ ہو جائے (۵)

نہ جانے کس کی رخصت ہو رہی ہے؟ فضائے گلستاں کیوں رو رہی ہے؟
نگاہِ حسن ہو کر دل سے بیزار متاعِ ہر دو عالم کھو رہی ہے
بہار آئی ہے دینے دعوتِ گل یہ میرے حق میں کانٹے بو رہی ہے
نہیں مٹتی کدورت بوستاں کی گھٹا ہر سال کیا کیا دھو رہی ہے
ضیا خورشید پہونچا ہے لبِ بام
(۶۹) ابھی تک ساری دنیا سو رہی ہے ۹

عشق سے حسن کو تمکیں جو نہ بیزار کرے پھر وہ کافر جو کبھی سجدے سے انکار کرے
جانتا ہوں کہ نہیں ظرف مرا قابلِ راز چاہتا ہوں کہ خدا محرمِ اسرار کرے

اس کی ناکردہ گناہی نہ کروں گا تسلیم — درسِ نیکی مجھے دے کر جو گنہگار کرے

جسے مجبور نہ کر دے دلِ وارفتۂ شوق — سحر و شام وہ کیوں طوفِ درِ یار کرے

قصۂ درد کہوں گا ابھی جلدی کیا ہے — جذبۂ دل کو خدا قابلِ اظہار کرے

عظمتِ عشق مسلم ہے بھری دنیا میں — یہ مقدر جو دلِ حسن نہ اقرار کرے

پُرمحبت ہیں یہ فطرت کے مناظر کتنے — سب کو حسرت ہے یہی کوئی ہمیں پیار کرے

جسے منظورِ نظر منزلِ آزادی ہو — پہلے کچھ روز طوافِ رسن و دار کرے

حرم و دیر تو سب ننگِ پرستش ہیں ضیا
مجھے فطرت فقط اپنا ہی پرستار کرے

(۷۰) (۱۰)

آتی ہیں مانگنے کو شعلے مری فغاں سے — جو بجلیاں زمیں پر گرتی ہیں آسماں سے

ہے گردِ کارواں بھی جادے سے اپنی پیما — اور رہیں باہیں خرابی آگے ہوں کارواں سے

آئی ہوئی ہے صحنِ گلزار پہ جوانی — کیا پھول کھل رہے ہیں رنگین جواں سے!

ہیں میری بےخودی کے قدموں پہ سر فگندہ — وہ سربلندیاں جو اونچی ہیں کہکشاں سے

رگ رگ میں اک خلش سی بھر دی ہے کاوشوں نے — اے فصلِ گل نکالوں کانٹے کہاں کہاں سے؟!

غیرت مری رہینِ منت ہوئی نہ اب تک — مجھ کو ملا ہے سب کچھ اپنے ہی آستاں سے

اصلاحِ نفسِ ظالم کب نیکیوں سے ہوگی — جاگے گا بتکدہ کیا آوازۂ اذاں سے!

بے انتہا فسانے پھیلے ہوئے ہیں ہر سُو | دنیا کو صرف ضد ہے میری ہی داستاں سے
کیوں ہی ضیاؔ نہ ہوں افکار میں بلندی | پایا ہے فیضِ ہیں نے سیمابؔ خوش بیاں سے
ہوں عصمتِ وفا سے نامطمئن ضیاؔ میں
کیا اپنے راز واپس لے آؤں رازداں سے؟

(۷۱) (۹)

خیال نطق سے بیگانہ ہو تو کیا کہئے | لبِ خموش ہی افسانہ ہو تو کیا کہئے
میں جانتا ہوں کہ توہینِ وضع ہے مستی | یہی شریعتِ میخانہ ہو تو کیا کہئے
جمالِ دوست کو دیوانگی سے کیا مطلب! | دل اپنے آپ ہی دیوانہ ہو تو کیا کہئے
ہو کوئی اور تو اس سے گلہ مناسب ہے | مگر جو دوست ہی بیگانہ ہو تو کیا کہئے
بغیر ساغر و مے بھی ہے کیف کا امکان | ترا خیال ہی رندانہ ہو تو کیا کہئے
میں چاہتا ہوں کہوں رنجِ عشق کی روداد | سلوکِ حسن حریفانہ ہو تو کیا کہئے
عزیز دل سے زیادہ ہے مجھ کو عصمتِ راز | ہر اک طرف ہی افسانہ ہو تو کیا کہئے
مذاقِ بزم کی اصلاح ممکنات سے ہے | فروغِ شمع ہی پروانہ ہو تو کیا کہئے
شبابِ عورت رنگینیٔ نظر ہے ضیاؔ
مگر نظر ہی فقیہانہ ہو تو کیا کہئے

(۷۲) (۹)

سجدہ کرنے کو درِ پیرِ مغاں باقی تو ہے | آبِ خود رو ہی سہی، اک آستاں باقی تو ہے

دورِ ماضی کا کسی صورت نشاں باقی تو ہے
یادگارِ سعی، گردِ کارواں باقی تو ہے

ہیں غنیمت باغِ دل کے بعد دل کے داغ بھی
وجہِ تسکینِ نظر کوئی سماں باقی تو ہے

اب نہیں وہ التفات اچھا تغافل ہی سہی
اک علاقہ اک تعلق درمیاں باقی تو ہے

دل ابھی محسوس کرتا ہے محبت کا اثر
جس کو میں سمجھا ہوا تھا رائیگاں باقی تو ہے

بے پئے مشکل ہے تکمیل نمازِ بے خودی
اور وہ ساغر ابھی وقتِ اذاں باقی تو ہے

ماسوا اسی کیوں گذارش میں کروں تسکین کی
دل کے بہلانے کو دردِ جاوداں باقی تو ہے

جی اسی کو دیکھ کر اے کشتۂ فصلِ بہار
اک ہیولہ سا بشکلِ گلستاں باقی تو ہے

سچ کہا تو نے ضیاؔ، رومانِ غم ہے ناتمام
ختم ہو کر بھی ابھی اک داستاں باقی تو ہے

(مطبوعہ رفاہِ عام پریس ہینگ منڈی آگرہ)